

میلے ہاتھ عبدالرب بھٹی

ہمارے ارد گرد پھیلی کشیدگی احساس عدم تحفظ کو جنم دیتی ہے... محرومی میں مبتلا کر دیتی ہے... انجانے اور پڑا سرار ماحول کا حصہ بن جانے والے ایک ایسے ہی شخص کا ماجرہ... اس کی اگلی منزل سراسر محبت کی منزل تھی... جستجو اور شوق کا بہاؤ اسے آگے دھکیل رہا تھا... اس کے جذبوں کی بے غرضی... وابستگی اور بے لوث محبت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ مسلسل ایسے ماحول میں بھٹک رہا تھا جس کا ہر منظر خوف و دہشت میں ڈوبا ہوا تھا... باثروت لوگوں کی حیوان پرستی کا شکار ہو جانے والوں کی حیرت انگیز صورت حال...

غفلت اور عداوت میں گم ہو جانے والی محبت کی جیت.....

نے مجھے جو خط لکھا تھا، اس کی تصویر کھینچ کر مجھے وائس ایپ کر دیا تھا۔ اسے مجھ تک فوری طور پر بات پہنچانے کا یہی ایک طریقہ آسان لگا تھا۔

اس کا خط پڑھنے کے بعد جب میں نے گہرا کراہے کا ل کرنا چاہی تو میں دہل گیا۔ مجھے اُمید نہ تھی کہ وہ اس قدر جلد اپنا نمبر بھی بند کر دے گی۔ مجھ سے ہر طرح کا تعلق قطع کر ڈالے گی۔

”تگینہ! کیا محض ایک نمبر بند کر دینے سے تم سمجھتی ہو میرا اور تمہارا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟“ میں بچوں کی طرح رو دینے والے انداز میں دوبارہ بڑبڑایا۔

”ہرگز نہیں، تگینہ! یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟ میں ابھی آرہا ہوں۔“ میں ایک دم جوش میں آ گیا۔

میں اس وقت میں دفتر میں تھا۔ میں نے شارٹ لیو دی اور ایک بیچے ہی دفتر سے اٹھ گیا۔ میرے پاس بلیک

تگینہ نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ کبھی میں سوچتا کیا واقعی وہ ایک ذہنی مرید ہے؟ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اپنے اس لغو خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

تگینہ میری پہلی اور آخری پسند تھی، محبت تھی اور میں اُسے دیوانہ وار چاہنے لگا تھا۔ وہ اب جیسی بھی تھی، میری محبت تھی۔ محبت صرف محبوب کی خوبیوں سے ہی تو نہیں کی جاتی، اگر وہ کسی ایسی مصیبت کا شکار تھی تو مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے تھی، اس مصیبت نے اُسے عارضے میں مبتلا کر دیا تھا۔ عارضہ تو مصیبتوں کا ہی شاخسانہ ہوتا ہے، وہ مصیبت دور ہو جائے تو عارضہ بھی خود بخود ختم ہو جایا کرتا ہے۔

”تگینہ! تم نے مجھ پر بھروسہ تو کیا ہوتا۔ میں بہت جلد تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا تھا۔“ میں خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

میرا سیل فون اس وقت میرے ہاتھ میں تھا اور اس

میں جاب کرتا تھا، جو میرے مطابق اور اچھی تھی۔ اکیلا آدمی تھا، بھلا میرا کیا خرچہ تھا۔ ایک اسٹوڈیو فلیٹ میں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔

میں کھاد بنانے والی ایک فیکٹری میں کلرک تھا۔ یہ منشی کے بین بین جاب ہوتی ہے۔

درحقیقت مجھے خالہ اور خالو نے ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ بہ قول اُن کے میرے ماں باپ کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہو گیا تھا، میں پانچ برس کا تھا۔ اس کے بعد خالہ نے مجھے گود لے لیا۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، بعد میں ان کی بھی اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا ایک لڑکی مگر آفرین ہے خالہ اور خالو پر کہ انہوں نے مجھے بھی اپنی اولاد ہی کی طرح پالا تھا۔

انہوں نے مجھے پڑھا لکھا کر جوان کیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے میری شادی بھی کر دینا چاہتے تھے اور مجھے بھی اس وقت کوئی اعتراض نہ تھا، کیونکہ اس وقت نگینہ میری زندگی میں نہیں آئی تھی لیکن شائلہ کے دل پر کوئی اور نو جوان دسک دے چکا تھا اور اس نے اسی سے شادی کر لی تھی۔ اب ان کا بیٹا تھا مگر میری اس سے کم ہی لگتی تھی جب سے اسے اس

حقیقت کا علم ہوا تھا کہ میں اس کا بڑا بھائی نہیں ہوں۔

میں اپنے ہیروں پر کھڑا ہو چکا تھا، ہم کراچی میں ہی رہتے تھے، مجھے ٹھنڈے میں ایک فیکٹری میں جاب کی آفر ہوئی اور میں وہیں چلا گیا۔ ٹھنڈے کراچی سے ایک سو دو کلو میٹر پر مشرق میں واقع سندھ کا ایک قدیم اور مشہور تاریخی شہر ہے۔

ٹھنڈے کے معنی ہی سندھی زبان میں ”دریا کے کنارے آباد ہونا ہے“ اصل لفظ ٹھنڈے ہے۔ بعد میں ٹھنڈے پڑ گیا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ ٹھنڈے کے قریب سے بھی بہتی ہے۔ میں جب کراچی جامع میں زیر تعلیم تھا تو دوستوں کے ساتھ اکثر پیچھے جمیل اور ٹھنڈے سیر و تفریح کے لیے آیا کرتا تھا۔ تاہم مزید... باتیں مجھے نگینہ نے بھی بتائی تھیں۔ وہ ادھر ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ جو آب مرحوم ہو چکے تھے، زمیندار تھے۔

اس شہر میں آنے کے بعد مجھ پر اس کی اسراریت کھلنے لگی، یہ واقعی ایک پُر اسرار اور قدیمی سا تاثر دیتا شہر ہے۔

یہاں سے گھوڑا باڑی کا ساحلی علاقہ بھی قریب تھا۔ مجھے سمندر اور ساحل شروع ہی سے پسند تھے۔ تنہا تھا اس



لے ہر روز شام میں سمندر کی طرف نکل جایا کرتا۔ ٹھٹھہ کے مشہور ساحلی علاقوں میں جاتی اور گھوڑا بازی مشہور تھے، اور بھی تھے مگر یہ میرے گھر اور فیکٹری سے قریب تھے اسی لیے میں ادھر چلا آیا کرتا تھا۔

یہاں... ماہی گیروں کی بستی کے علاوہ کچی سڑک کی جانب ایک بڑی آبادی بھی تھی، جہاں بڑے چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے اور کھاتے پیتے لوگ رہا کرتے تھے۔

میں نے ایک کمرے کا اسٹوڈیو فلیٹ یا یوں کہہ لیں پورٹن لے رکھا تھا۔ میں تنہا تھا، فارغ اوقات میں جاسوسی ناول اور کتابیں پڑھتا یا پھر دریا یا جھیل کی سیر کو نکل جاتا۔ میرے پاس بانیک تھی۔

ٹگینہ نے ان دونوں فیکٹری میں نئی ملازمت کی تھی۔ اگرچہ اور بھی لڑکیاں تھیں لیکن جانے کیا بات تھی یا پھر یہ دل کی بات تھی کہ جو بھا جائے، یوں ٹگینہ مجھے بھاگتی تھی۔

وہ بھی مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ ہم دونوں اکثر ہی ڈیوٹی سے واپسی میں اپنے اپنے گھر جانے کے بجائے بانیک پر ساحل سمندر کی طرف نکل آتے تھے۔

اگرچہ کمپنی کی پک اینڈ ڈرائیو کی سہولت ایک آرگنائزیشن کو شری صورت میں موجود تھی۔

عقدہ کھلا کہ ٹگینہ بھی میری طرح اندر سے تنہا تھی، حالانکہ اس کے گھر والے تھے۔ ایک دادا اور بڑا بھائی جس کا نام دل مراد تھا۔ دادا سائیکس پچل کے نام سے مشہور تھے۔ وہ اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ کھاتے پیتے لوگ تھے اور صاحبِ جاگد ادبھی۔ بہ قول ٹگینہ کہ وہ خود کو مصروف رکھنے کی خاطر یہ جاب کرتی تھی۔

ایک دن میں نے اس کی طبیعت میں کچھ محسوس کر کے دریافت کیا۔ ”ٹگینہ! کیا بات ہے، تم اکثر مجھ سے اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے کسی انجانے خوف میں کیوں مبتلا ہونے لگتی ہو؟“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا تھا۔ اس وقت ہم ساحل سمندر کے قریب ماہی گیروں کی بستی سے ذرا دور ساحل سمندر پر پتھروں کے ڈھیر پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ سمندر کی جانب کر دیا، جہاں کچھ کشتیاں تیر رہی تھیں اور ان کے اوپر بگے اڑائیں بھرنے میں مصروف تھے۔

”شاید تم اس لیے کسی انجانے خوف کا شکار ہو کہ ہمارا اور تمہارا ہمیشہ کا ساتھ ممکن نہیں؟ اگر ایسی کوئی پریشانی ہے تو پلیز، مجھ سے شیئر کرو، ہم دونوں مل کر اس کا حل نکال لیں گے۔“

میں نے اس کے خوف کو روایتی رنگ میں جانا تھا حالانکہ ایسی بات ہی نہ تھی۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ بالآخر ٹگینہ نے کہا۔ ”تو پھر، تم باتیں کرتے کرتے ایک دم اداس اور خوف زدہ سی کیوں ہونے لگتی ہو؟“ میں نے محبت سے پوچھا۔ ”بلکہ..... اکثر تو اس خوف تلے تم مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کرتیں اور ایک دم اٹھ کر گھر جانے کا کہنے لگتی ہو؟“

”میں شاید اس خوف تلے ذہنی مریضہ بن چکی ہوں۔“ وہ بولی۔ مجھے اس پر بے اختیار پیار آ گیا اور ترس بھی۔ میں نے بڑی محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ساحل سمندر کی نرم عطر بیز ہواؤں میں نباتاتی باس تھی۔ نرم ہواؤں کے جمونکے اس کے ریشمی گھنے بالوں کو سہلاتے ہوئے میرے چہرے پر بکھیر گئے۔ اس کی تکہت نے مجھ پر بے اختیار سی طاری کر دی۔ ٹگینہ کے حسین اور معصومیت لیے چہرے پر ایک غمگین سی ادا سی تھی۔

میں نے کہا۔ ”بگلی! میرے کہنے کا یہ مطلب تھوڑی ہی تھا، لیکن میں محسوس کر رہا ہوں تم کسی انجانے پریشانی اور تشویش کا شکار ہو۔ مجھے بتاؤ۔“

ٹگینہ نے میری جانب اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر دیکھا اس کی جھیل سی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔

”جاوید! میں نے زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت کی ہے وہ بھی صرف اور صرف تم سے۔ مجھے تمہارے ہی کھونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، یہ تو میں بھی سمجھتا تھا۔“ میں نے اسی کے انداز کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شکر تھا کہ وہ کچھ بولی تو تھی۔

”دیکھو، ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے سچی اور اٹوٹ محبت کرتے ہیں اور ایسے دلوں کے درمیان جدائی کا ڈر ہوتا ہے، یہ ایک فطری امر ہے، کوئی نئی بات نہیں، بس تم اسے دل پر مت لو۔“

”میں نے ایسا ہی کیا تھا جاوید!“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”لیکن..... نجانے کیا بات ہے، بیٹھے بیٹھے میں اکثر ڈر جاتی ہوں، م..... مجھے لگتا ہے جیسے تمہیں مجھ سے کوئی ہمیشہ کے لیے چھین لے گا، میں تو اپنی جان بھی تم پر قربان کر دوں، لیکن یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی کہ میری وجہ سے کوئی تمہاری جان کا دشمن بن جائے۔“

”اوہ..... کیا ایسی کوئی بات ہے؟ کیا گھر میں کوئی

کیلے ہاتھ

تنگ سی سڑک جاتی تھی۔ میں اسی پر بائیک دوڑا رہا تھا۔ راستے کی دونوں جانب گنجان جھاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، بارش کا بھی موسم ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دن میں بھی تاریکی کا سا گماں ہوتا تھا۔ کچھ آگے جا کر میں نے سڑک کو گھومتے دیکھا۔ سہ پہر کا وقت اب شام کے گلجے میں بدلنے لگا تھا۔

میں مناسب رفتار سے بائیک دوڑاتا آگے بڑھتا رہا۔ راستے کی ایک جانب سیاہی مائل، گاڑھے پانی کی تالاب نما جمیل سی نظر آرہی تھی۔ ساکت اور پرسکون پانی جس کی سطح پر ایک بھی شکن نہ تھی۔

دوسرے کنارے پر سفیدی چیز فضا میں بلند ہوئی، ایک لمبے کے لیے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی پھر آواز اور خود وہ پرندہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

آسمان پر بادل سیاہ ہونے لگے تھے۔ راستہ اچانک ہی تاریک ہو چلا تھا۔ مجھے بارش کی پروا نہ تھی۔ مجھ پر تو نقطہ ایک ہی دھن سوار تھی کہ گھینے نے خود سے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہیں اس نے کسی کے دباؤ میں تو ایسا نہیں کیا تھا؟ ہم دونوں ہی پڑھے لکھے تھے اور اپنی زندگی کے اہم فیصلوں میں آزاد تھے۔

اب دونوں طرف بلند جھاڑیوں کی باڑ تھی۔ چوتھائی میل کا فاصلہ ایک پلپلا کے نیچے بنی سڑک میں سے گزرا کے دوسری جانب پہنچا تو ایک چھوٹا سا صحرائی خطہ ابھرا۔ دائیں طرف دریا کے چنگیلے دھارے کی جھلک نظر آرہی تھی، دریا کے کنارے وہ بڑا سا مکان تھا جو میری منزل مقصود تھی۔

وہ حویلی نما مکان عام آبادی سے الگ تھلک واقع تھا۔ اُس طرف کھیت اور ہریالی بھی نظر آتی تھی۔

بہر کیف، میں بائیک روک کر نیچے اتر آیا۔ مکان قدیم طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ میں ایک بار یہاں گھینے کے ساتھ آچکا تھا، مگر مجھے ایک تلخ تجربہ ہوا تھا وہ یہ کہ کسی نے میری موجودگی کو گھینے کے ساتھ پسند نہیں کیا تھا۔ میں بھی ضدی آدمی تھا۔ پیچھے ہٹنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی تھی۔ اب دوسری بار آیا تھا مگر اکیلا۔

گھینے نے ایک بار مجھ سے ذکر کیا تھا کہ اس کا گھر ایک بہت بڑے باغ کے عین وسط میں واقع ہے، مجھے دکھایا بھی تھا، لیکن اب شاید کچھ محل وقوع مجھے بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اگرچہ باغ اپنی جگہ موجود تھا۔

مجھے اعتراف تھا کہ گھینے کے بارے میں مجھے اب بھی کم ہی معلومات تھیں۔ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ ایک یتیم لڑکی

ناراض ہے مجھ سے، یا انہیں تمہارا اور میرا ملنا پسند نہیں، میرا مطلب ہے تمہارا بڑا بھائی، شاکر.....

”شاید..... وہ بہت تند خو ہے۔ سربراہ تو گھر کے دادا جان ہی ہیں مگر دل مراد کا اثر گھر میں زیادہ چلتا ہے، دادا جان اسی کی بات کو فوقیت دیتے ہیں، جامداد اور زمینوں کا کام بھی اسی نے سنبھال رکھا ہے اور..... اور.....“

وہ کہتے کہتے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ویر ہو رہی ہے میں چلوں گی۔“

میں پریشان کن الجھن کا شکار ہو گیا۔

چند دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کترانے لگی ہے۔ بالآخر ایک دن جب میں دفتر پہنچا تو چونکا دینے والی اطلاع میری منتظر تھی۔

گھینے نے جاب سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ کیا وہ اپنے بھائی کے رعب اور دباؤ میں آگئی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی؟

ابھی میں اُس کے گھر جانے کی ٹھان ہی رہا تھا کہ واٹس ایپ پر اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط کا عکس موصول ہو گیا۔

میں نے خط پڑھا اور ہک دک رہ گیا۔ میں نے اسی وقت اسے فون کیا جو بند ملا۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ نچلا بیٹھنے والا تو اب میں بھی نہیں تھا، میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ اس کے بھائی سے جھگڑا کرنا پڑے، میں گھینے سے ضرور ملوں گا۔

خط میں اُس نے یہی لکھا تھا کہ وہ ایک ذہنی مرینڈ ہے، وہ مجھے مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔ یہاں تک بھی اس نے لکھا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کر کے بھی پیچھتا رہی تھی، اس محبت نے اس کے انجانے خوف کو مزید سوا کر ڈالا ہے۔ اگر میں نے اُس سے شادی کر بھی لی تو اس کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن کر رہ جائے گی۔ وہ میری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی، یہی تھی اور بے لوث محبت کا تقاضا ہے کہ وہ ابھی سے ہی میرے راستے سے ہٹ جائے۔ میرے سامنے ایک سنہرا مستقبل تھا وغیرہ۔

”میں تمہاری کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گھینے! میں ابھی آ رہا ہوں۔“

میں نے ایک جو شیلے انداز میں کہا۔ اپنی بائیک نکالی اور سیدھا گھینے کے گھر کا رخ کیا۔

☆☆☆

گھینے کا گھر تھوڑا دور سی مگر قابل رسا تھا۔ اس طرف

ہے۔ اپنے بھائی دل مراد کے ساتھ رہتی ہے جو اپنے دادا
سامنے بچل کے مکان اور زمینوں کی نگرانی کرتا ہے۔ میری
نظر مکان کی طرف اٹھ گئی۔

یہ سرخ اور قرمزی پتھروں کی بنی عمارت تھی جو
اندھیرے میں بڑی پُر اسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یوں
محسوس ہوتا تھا جیسے زمین نے درختوں کی اوٹ میں کسی بڑی
سی چٹان کو اُگل دیا ہو۔ میں حویلی نما مکان کے سامنے آکر
رک گیا۔

تمن طرف سے سیاہ پانی سے گھرا ہوا یہ مکان واقعی
عجیب ہی تاثر پیش کرتا محسوس ہوتا۔ اس تالابی یا دریائی پانی
میں گدلی اور سیاہ آبی گھاس پھوس بھی نظر آتی تھی۔

میرے ذہن میں نگینہ کا پیکر ابھرا اور رگوں میں
دوڑتے لہو کی گردش جوش اختیار کرنے لگی۔ میں نے کندھے
جھٹکے، آگے بڑھا۔ طویل ہائیک کے سفر نے مجھے کچھ تھکا بھی
دیا تھا۔ پندرہ بیس کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہی کا سفر طے کر کے
میں یہاں پہنچا تھا۔

میں ابھی بڑے سے گیٹ نما دروازے کے قریب
ہی پہنچا تھا کہ ٹھٹک کر رکا، میرے کانوں میں بانسری کی
سُر ملی آواز نکل گئی۔ مقامی زبان میں جسے مرلی دُھن کہتے
ہیں۔ کوئی بڑے ہی ماہر انداز میں کسی لوک گیت کی دُھن
بجھا رہا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ اتنے بڑے لوگ ہونے کے باوجود
کوئی چوکیدار یا نوکر نظر نہیں آیا تھا اب تک۔ میں نے
دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ تو مرلی کے سُرفضا میں
تخلیل ہوتے رہے پھر یکایک خاموشی چھا گئی۔ میں
دروازے پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ دروازہ کھلا اور ایک حمایہ
نظر آیا۔

دروازے کی دوسری جانب ہال کرا مجھے تاریک
دکھائی دیا۔ میں نے ابھی کسی کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں
سنی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اندھیرے میں کوئی ناقابل
شناخت متحرک شبیہ دروازے تک آگئی تھی۔

میں چند قدم آگے بڑھا۔ دروازے میں ایک
نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ دُبلا پتلا جسم اور سیاہ
بال۔ ٹکجے سے اُجالے میں یہی دیکھ سکا تھا۔ میں کچھ پہچان
نہیں کیا، وہ نگینہ کا بھائی دل مراد ہی تھا۔ دوسری بار دیکھ رہا تھا
اُسے..... اسی لیے کچھ کنفیوز رہا۔

”میں نگینہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“
”وہ یہاں نہیں ہے.....“ اس نے دکھائی سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں معلق ہو گیا ہوں۔ لمبے
بھر کے لیے مجھے جیسے سکتے سا ہو گیا۔ بھلا وہ کہاں جاسکتی
ہے؟ جبکہ مجھے نگینہ سے گھر پر ملنے کی پوری اُمید تھی۔ میں
اس سے بات کرنے کے لیے اس قدر بے چین تھا کہ بے
دھڑک اس کے گھر چلا آیا تھا۔ میں اس سے مل کر یہ پوچھنا
چاہتا تھا کہ آخر اسے یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں گئی ہوئی ہے؟“
سایہ دروازے سے آگے بڑھا۔ شام کے جھپٹے میں
اس کا چہرہ مزید اُجاگر ہو گیا۔ وہ ایک تو مند خوب صورت
نوجوان تھا۔

پہلی ملاقات میں جب نگینہ بھی میرے ساتھ تھی، اس
سے میرا مختصر اُتعارف ہوا تھا۔ نگینہ نے مجھے اس وقت اپنے
دادا اور بھائی سے ایک کولیگ کی حیثیت سے ملوایا تھا۔

”کیا تمہیں نہیں پتا؟“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں
کہا۔ وہ بھی مجھے شاید پہچان چکا تھا۔
”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دفتر بھی نہیں آئی۔“

وہ کچھ روز سے.....
دل مراد نے میری بات کاٹ دی۔ اُس کا انداز مجھے
پتھر ایا ہوا لگا۔ ”وہ اس وقت بھی اپنے معالج ڈاکٹر مظفر کے
گھر گئی ہوئی ہے۔“
”گھر؟“

”ڈاکٹر مظفر اپنے گھر میں ہی کلینک کرتے ہیں۔“
”اوہ، اچھا، پتا بتا سکتے ہو؟“ مجھے حیرت تھی کہ وہ
ایکلی ڈاکٹر کے کلینک کیوں گئی ہے؟
دل مراد نے مجھے ڈاکٹر کے گھر کا پتا بتا دیا جہاں بہ
قول اس کے کلینک کرتا تھا۔

”تم یہاں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کر سکتے ہو۔“
اس نے کہا۔ وہ مجھے کچھ نرم لگا، مگر جانے کیوں میرا دل اس
کے بھائی کے ساتھ یہاں رکنے کو نہ چاہا، نجانے وہ کس قسم
کے سوالات کرتا مجھ سے، پھر میں اس وقت نگینہ کی طرف
سے بہت بے چین بھی تھا۔

میں شکر یہ کہہ کر پلٹا، دو ایک قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ
اس نے عقب سے پکارا۔
”سنو۔“

میں پلٹا۔ وہ بولا۔
”میں نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر کا کلینک جھیل کے پار
ہے..... تقریباً تین میل دور..... لیکن میرا خیال ہے اگر تم
سڑک سے جاؤ تو زیادہ آسانی ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرانے

بدی ہونے لگی تھی۔ آخر یہ پانی میں گر اگون تھا؟
میں نے اپنا خیال اس طرف سے ہٹا کر دوبارہ
دروازے پر دستک دی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔
میری حیرت دو چند اور پریشانی سوا ہونے لگی۔ میں واپس
پلٹا، قدم چمٹے طے کرتا ہوا نیچے آیا اور اپنی بانگ کے پاس جا
کر کھڑا ہو گیا۔ میں سگریٹ کم ہی چتا ہوں، کبھی کبھار شوقیہ
پینے کے لیے ایک پیکٹ پاس رکھتا ہوں جو دو تین دن چل
جاتا ہے۔

میں نے ایک سگریٹ نکال کر سلا لیا اور گوگو سے
انداز میں کھڑا کسی آہٹ کا خضر رہا، مگر مجھے کچھ بھی سنائی نہ
دیا۔ عجیب ڈرامائی، پراسرار اور ابھی ہوئی سی صورت حال
تھی۔ میں گنینے سے طے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔
نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بڑی مصیبت
میں ہو۔

ابھی میں نے دو تین ہی کش لیے تھے کہ اچانک
میری خضر اور ٹھکی ہوئی سماعتوں سے کسی لڑکی کی آواز
نکرائی۔ درو میں ڈوبی ہوئی آواز.....
”جج..... جاوید..... جاوید.....“

میں نے فوراً سگریٹ پھینک دیا۔ یہ آواز گنینے کی
تھی۔ میں چونک کر اس طرف متوجہ ہوا۔ اگلے ہی لمحے میری
بے تابانہ نظریں گنینے پر مرکوز تھیں۔ غالباً وہ قریب ہی کہیں
موجود تھی۔ میرے لائٹریا سگریٹ کی روشنی میں وہ میری
طرف بھاگی چلی آئی تھی۔

”گنینے.....!“ میں نے بے تابی سے کہا۔ وہ لپک کر
مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے درمیانہ سینے میں جیسے ٹھنڈک اتر
آئی۔ وہ پھر الگ ہوئی۔ اس کے نرم و گداز ہاتھ اب تک
میرے ہاتھوں کی گرفت میں جسے رہے۔

”تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے کہا۔ ”تم
کب آئے تھے؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو یہاں پہنچا ہوں۔“ میں نے
جواب میں کہا۔ ”میں وہاں تمہارے گھر بھی گیا تھا، تمہارے
بھائی نے بتایا تھا کہ تم یہاں آئی ہو تو سیدھا ادھر ہی چلا
آیا۔“

”اوہ..... جاوید.....!“ گنینے نے کانپتی ہوئی آواز
میں کہا۔ میں نے گہری نظروں سے گنینے کی طرف دیکھا۔
مجھے ایسے میں اپنے دل پر ایک بوجھ محسوس۔

”گنینے..... کیا ہوا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟ یہ تم نے
مجھے اپنا خط دس ایپ کیا تھا اور پھر اپنا فون بھی بند کر دیا، کیا

لگا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ میں ایک سنسناتی ہوئی اسراریت
محسوس ہوئی۔ مجھے بدستور اپنی جانب ہٹتا ہوا آگے بولا۔
”مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گی، لیکن اگر تم
اس سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہو تو..... واپس بڑی سڑک
پر چلے جاؤ، اس کے بعد اٹنے ہاتھ گھوم جانا۔ آدھ میل آگے
جا کر ایک مرتبہ پھر بائیں سمت گھوم کر تم ڈاکٹر کے گھر پہنچ جاؤ
گے۔ وہ راستہ بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ تم یہاں آتے
وقت ضرور دیکھ چکے ہو گے۔“

مجھے اس قدر تفصیل سن کر کچھ حیرت ہوئی۔ تاہم اچھا
تھا کہ اس نے مجھے اچھا گائیڈ کر دیا تھا۔ یوں بھی ڈاکٹر مظفر کا
پتا ایسا تھا کہ اس کی قیام گاہ کو تلاش کرنا کوئی اتنا مشکل کام
نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کا قافلے سے شکریہ ادا کیا اور
روانہ ہو گیا۔

جلدی ہی مجھے بڑی سڑک کے کنارے بائیک کی ہیڈ
لائٹ میں ڈاکٹر مظفر کے نام کی تختی صاف نظر آگئی۔ اس کے
عقب میں مجبور اور پید مشک کے درختوں کا ایک طویل سلسلہ
تھا۔ دائیں سمت عمارت تھی۔ مکان میں اس وقت صرف
ایک بلب روشن تھا۔

میں نے بائیک کا انجن بند کیا۔ ہیڈ لائٹ بھی بجھ گئی۔
اسے سائنڈ اسٹینڈ کیا۔ قدم چمٹے کر کے اوپر دروازے تک
پہنچا۔ یہاں ٹھنڈ کا احساس زیادہ ہو رہا تھا۔ ایک عجیب بات
محسوس ہوئی۔ یہاں خلاف توقع مجھے ساٹا محسوس ہوا۔ اگرچہ
علاقہ ہی ایسا تھا مگر بہر حال یہ ایک ڈاکٹر کا کلینک تھا، کوئی تو
نظر آتا۔ میں نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

دستک کی آواز پر سکون سہی، مگر اندھیرے ماحول
میں بڑی عجیب محسوس ہوئی۔

اچانک مجھے دائیں سمت میں پانی کا ایک جھماکا سنائی
دیا۔ کوئی چیز پانی میں گری تھی یا پھر کوئی کودا تھا۔ وہ جگہ اس
روشنی سے باہر تھی، جو اس مکان کی پیشانی پر لگے بلب سے
آ رہی تھی۔ لہذا میں کسی کو نہ دیکھ سکا۔

جس کے ہاتھوں مجبور ہو کے میں آواز کی سمت بڑھا
تو وہاں جھیل کا کچھ حصہ مکان سے نکل کر نظر آیا۔ اس طرف
ایک کشتی بھی بندھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹا سا چوبی فلیٹ فارم
بنا ہوا تھا۔ چونکہ یہ سارا دریائی علاقہ تھا، سیر و تفریح کی غرض
سے بھی اور کچھ یہاں اکثر تیز بارشیں اور سیلابی صورت حال
رہتی تھی اسی لیے بھی کچھ لوگوں کے پاس اپنی ذاتی کشتیاں
بھی ہوتی تھیں۔ میں واپس مڑ گیا۔ مگر میرے اندر ایک کھد

تمہیں میری پریشانی کا بھی احساس نہ ہوا۔“
وہ خاموش رہی۔ میری شکایت پر اس کے چہرے سے دکھ عیاں تھا۔

”میں..... میں ایک مریضہ ہوں۔“
”مجھے یقین نہیں، لیکن اصل وجہ ضرور جاننا چاہوں گا، کیا یہ ڈاکٹر مظفر تمہارا نفسیاتی معالج ہے؟“
وہ خاموش رہی۔
”جواب دونا۔“

”ہاں۔“ بالآخر اس نے جواب دیا۔

”وہ کیا کہتا ہے اس بارے میں؟“

”دراصل، میں نے اسے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔“
گنینہ نے میرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
مجھے اس کی بات عجیب لگی مگر میں بھی دھن کا پکا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”میں آج شام اسی سلسلے میں ڈاکٹر مظفر سے ملنے آئی تھی۔ میں..... میں دراصل آج ڈاکٹر کو اصل وجوہات بتا دینا چاہتی تھی۔“

”افسوس! تم نے مجھے نہیں بتایا اور ڈاکٹر کو بتانے چلی آئیں؟“ میں نے پھر شکوہ کیا۔
”وہ میری بات سمجھ سکتا تھا، ڈاکٹر تھا وہ۔“ گنینہ بولی۔

”کیا کہا پھر ڈاکٹر نے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں یہاں پہنچی تو وہ موجود ہی نہیں تھا.....“

”کیا.....؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”اُس کی بات پر مجھے چونکا دینے والا جھٹکا لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نارمل ہو گیا۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ گنینہ مجھے صحیح سلامت مل گئی تھی ورنہ تو نجانے میں کس قدر وحشت انگیز وسوسوں کا شکار رہا تھا۔“

”میرے ساتھ چلو اب.....“ میں نے کہا۔ ”نہیں تمہیں گھر لے چلوں گا۔ ڈاکٹر سے تو تم کل بھی مل سکتی ہو۔ دیے اگر تم ایک درجن ڈاکٹرز سے بھی مشورہ کرو گی تو وہ تمہیں یہی کہیں گے کہ سرے سے تمہیں کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔ ہاں! اگر اپنی فیسیں کھری کرنی ہوں تو وہ تمہیں بیماریوں کی ایک لمبی لسٹ بتا دیں گے۔ تمہیں بہر حال اس طرح خود سے مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اب تم میرے ساتھ ہو، تمہاری موجودگی میں مجھے اس قدر سکون مل رہا ہے جاوید.....! مجھے پتا نہ تھا کہ تم خط پڑھ کر اس قدر پریشان اور بے چین ہو جاؤ گے میرے لیے

کہ یہاں تک چلے آؤ گے۔“ گنینہ نے پرسکون انداز میں کہا۔

”تمہیں قرار مل گیا نا۔ میں ہی تمہاری دوا ہوں یگی!“ میں نے بھی مسکرا کے کہا۔

”ہم بائیک کے قریب آ گئے تھے۔“
”تم تو ٹھیٹ اور دیوانے عاشقوں کی طرح میرا پیچھا کرتے ہوئے آ گئے۔“ وہ پھر مسکرائی۔

”میں تمہاری محبت میں اس سے بھی آگے جاسکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں.....“ گنینہ نے آہستگی سے کہا۔ ”میری کار اُس طرف کھڑی ہے۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”وہ تو تمہیں چلنا ہی تھا۔“ میں بھی ڈھٹائی سے مسکرایا۔ تب ہی اچانک مجھے کچھ یاد آیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے مجھے رکتے پا کر پوچھا۔
”میں نے یہاں تھوڑی دیر پہلے پانی میں ایک چھپا کے کی آواز سنی تھی۔“

”اوہ..... اچھا۔“ گنینہ بولی۔

”کیا تم نے بھی سنی تھی؟“

”نہیں۔“ گنینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا اندر کوئی بھی نہیں؟“

”کلینک کا اینڈنٹ تو ہوتا ہے مگر وہ بھی کہیں غائب تھا۔ میں اندر ہی انتظار گاہ میں جا بیٹھی تھی اور پریشان تھی۔“
”آؤ تو ذرا دیکھیں۔“ میں نے اپنے اندر ہونے والی کھد بد سے مجبور ہو کے کہا۔

”چلو۔“ وہ بھی تیار ہو گئی۔ میں اور وہ اسی طرف آ گئے۔

دائیں طرف لان تھا۔ آس پاس گھنی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ہمارے بائیں جانب قدرے عقب میں گھاٹ سا بنا ہوا تھا۔ مشرقی اُفق پر چمکتا ہوا چاند اس وقت بڑا دل کش منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کا عکس جھیل میں کسی چمک دار جلی جھلی کے مانند نمایاں تھا۔

چوبی پلیٹ فارم پر آ کر میں اور وہ جھک جھک کر پانی میں دیکھنے لگے۔ کشتی ایک جانب بندھی ہوئی تھی۔

دفعاً گنینہ کے حلق سے ایک چیخ سی خارج ہوئی۔ میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ میں اگر فوراً ہی اسے اپنی بانہوں میں نہ جکڑ لیتا تو وہ نیچے گر جاتی۔

”کیا ہوا.....؟ تم خوف زدہ ہو کر کیوں چیخیں، کیا نظر

میلے ہاتھ

بالآخر میں نے کہا اور نگینہ کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ سیلے سیلے ماحول میں کسی جالور کے بولنے کی محسوس ابھری تھی۔ جیسے وہ رو دیا ہو۔
ذرا ہی دیر بعد میں اپنی بانیک پر اور وہ اپنی کار میں واپس پلٹ رہی تھی۔

☆☆☆

اس وقت کمر کسی ڈرامے کے سیٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ کشادہ کمر ڈاکٹر مظفر کی مطالعہ گاہ تھی۔ گول میز، آرام کرسی، جس پر اس وقت علاقے کا ایس ایچ او، مختار علی بیٹھا ہوا تھا۔ آتش دان، جس میں کوئلے دھک رہے تھے۔ ان سب کے علاوہ کمرے میں چھ سات افراد تھے جن کا وہ خوبی جائزہ لے چکا تھا۔

ایس ایچ او مختار علی ایک قوی الجبہ آدمی تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے ناری مگر کسی قدر نرم خود تھا۔ مجھے یہ آفیسر ایک گھاگ اور تجربے کا محسوس ہوا تھا۔ نگینہ اپنے بھائی دل مراد کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس حادثے سے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہو۔ دل مراد نے اپنے ایک بازو سے اسے سہارا دے رکھا تھا۔

ان تین افراد کے علاوہ دو آدمی اور ایک عورت بھی کمرے میں موجود تھے۔ گمان تھا کہ ان سب میں سے کوئی ایک قاتل ضرور ہے۔ خود میں غور سے ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر ابھرنے والی کسی علامت سے میں ہی کوئی اندازہ قائم کر سکوں۔

عورت کا نام بیگم سرور تھا۔ وہ ایک سنجیدہ اور پُر وقار عورت تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ بے حد مغموم نظر آرہا تھا، لیکن چہرے پر کھینچی ہوئی سلوٹوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ اس کی آنکھیں قدرے بھوری مائل سیاہ تھیں اور عمر پینتیس سال سے متجاوز ہی محسوس ہوئی۔

مجھے پتا لگا تھا کہ کسی زمانے میں یہی عورت ”سز مظفر“ ہوا کرتی تھی۔ اس عورت کی یہاں موجودگی مجھے عجیب لگی تھی اور وہ خود بھی..... لیکن مختار علی نے اگر اسے یہاں طلب کیا تھا تو ضرور اس کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی تھی۔

دوسرا آدمی دراز قامت تھا اور یہ ڈاکٹر مظفر کا قانونی مشیر تھا۔ تیسرا آدمی قدیر تھا، وہ ایک خوب روٹو جوان تھا۔ وہ بیگم سرور کا ملازم تھا۔ ایک ڈاکٹر مظفر کی کلینک کا اینڈنٹ تھا۔ کمال شاہ..... وہ ایک ادھیڑ عمر مگر مضبوط تن و توش کا مالک شخص تھا۔ اس کی شرافت اور دیانت داری ہی نہیں

آیا تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس نے اُنکی سے پانی کی سطح کی جانب اشارہ کیا۔ پارے خوف سے اس کے حلق سے آواز نہیں برآمد ہو پارہی تھی۔

اس طرف پلیٹ فلوئم کی مختصر سی سبز حیاں نیچے پانی میں اتر رہی تھیں۔ میں جھکا جھکا اس طرف گیا اور مزید قریب ہو کے پانی میں جھانکا۔

میں بڑی طرح چونک پڑا۔ اندر کچھ آبی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے سینے کے بل لیٹ کر انہیں ہٹایا تو پانی میں سے ایک ہاتھ نظر آیا۔ ایک انسانی ہاتھ..... جو کھائی تک پانی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہاتھ کا کچھ حصہ ایک جھاڑی کے دو شاخ میں پھنسا ہوا تھا۔ ہاتھ کی بے جان انگلیاں مردہ سون کے پھول (کنول) کے مانند بکھری ہوئی تھیں۔

اس بے جان جسم کو اوپر لانا چنداں مشکل نہ تھا۔ میں نے نگینہ کو حوصلہ رکھنے کی تلقین کی اور اندر دوڑ گیا۔ وہاں سے ایک رسی لے آیا۔ اس کا ایک سرا پلیٹ فارم کے ایک ستون سے باندھا اور دوسرا اپنی کمر کے گرد پھر پانی میں اتر گیا اور پھر لاش کو باہر سبز حیاں تک لے آیا۔

تب تک نگینہ بھی سنبھالا لے چکی تھی۔ اس نے بھی نیچے آکر میری مدد کی اور پھر ہم دونوں لاش کو پلیٹ فارم تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ ایک پست قد بوڑھے آدمی کی لاش تھی۔ تب ہی نگینہ نے مجھ سے کچپانی آواز میں کہا۔

”اوہ..... یہ تو ڈاکٹر مظفر کی لاش ہے۔“

میں نے چونک کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں خوف سے پھل گئی تھیں۔

”یہ دل کا مریض تھا، شاید اسے اچانک دل کا دورہ پڑا ہوگا۔“

”نہیں۔“ میں نے سرکونٹی میں جنبش دے ڈالی۔ لاش کو پانی سے نکالتے وقت میری انگلیاں اس کے سر سے ٹکرائی تھیں۔ میں نے تب ہی محسوس کر لیا تھا کہ ڈاکٹر مظفر کی کھوپڑی کا عقبی حصہ پکچا ہوا ہے۔

میں نے نگینہ کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا اطمینان کرنے کے لیے جیب سے لائٹر نکالا اور اسے روشن کر کے لاش پر جھک گیا۔

”یہ حادثہ نہیں ہے، کسی نے اس کے سر پر اتنی شدید چوٹ ماری ہے کہ بھیجا نکل آیا ہے۔ یہ صریحاً قتل کی واردات ہے۔“

وقاداری کی بھی بیگم سرور تو کیا پورے علاقے نے گواہی دی تھی کہ وہ ایک شریف انفس انسان تھا اور عرصے سے ڈاکٹر مظفر کی خدمت پر مامور تھا۔ وہ اس وقت اس قدر مشغوم اور غم زدہ نظر آ رہا تھا کہ جیسے اس کا کوئی اپنا سر گیا ہو۔ مختار علی، بیگم سرور سے پوچھ کر رہا تھا اور وہ جواب میں اسے بتا رہی تھی۔

”گنینہ اس وقت بالکل نا سمجھ تھی۔ وہ بہت معصوم تھی۔ اکثر کلینک آتی تھی، میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ دیگر اور خواتین مریمضامیں میری دوست بن چکی تھیں لیکن افسوس.....“ کہتے ہوئے وہ ذرا رکی، پھر ایک سردی آہ بھرنے کے بعد وہ دوبارہ بولی۔

”افسوس کہ ڈاکٹر مظفر سے میری زیادہ عرصے نہ بن پائی۔ مجھے اس کا آج تک افسوس ہے اور گنینہ کو بھی تھا۔ مزے کی بات تو یہ کہ گنینہ سمیت دیگر مریمضامیں سے یہ سن کر مجھ پر عقدہ کھلا کہ خود ڈاکٹر مظفر کو بھی اس کا افسوس ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔

عموماً طلاقوں کے بعد ہی دونوں فریقین کو صحیح غلط کا احساس ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔ وہ ایک گہری ہمکاری خارج کرنے کے بعد رک گئی۔

میرے لیے یہ انکشاف تھا کہ یہ اجنبی خاتون ڈاکٹر مظفر کی بیوی بھی رہ چکی ہے۔ بہر حال مجھے جانے کیوں یہ خاتون کچھ چالاک اور ہوشیاری محسوس ہوئی۔

ساتھ ہی میرے ذہن میں اب ایک ہی بات سمجھ آئی کہ ضرور کوئی وصیت کا بھی معاملہ تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے لیے کیا چھوڑا گیا ہے۔ یا پھر اس نے آسرا کر رکھا ہو کہ کیا خبر ڈاکٹر مظفر نے اس کے لیے بھی کچھ نام کر رکھا ہو، حالانکہ اب وہ ”بیگم سرور“ بن چکی تھی۔

ڈاکٹر مظفر کی جائداد کافی تھی۔ ڈاکٹر کے قانونی مشیر کے چہرے سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی۔ ایڈووکیٹ مسعود کو جیسے ہی ڈاکٹر مظفر کے قتل کی اطلاع ملی، وہ فوراً اپنی کار میں یہاں آن پہنچا تھا۔

”ایک دن گنینہ نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر مظفر مجھ سے ملنے کا تمنی ہے..... مگر مجھے یہ بات سخت ناپسند تھی۔ میں نے انکار کر دیا، پر..... اس کے ہمیں اصرار پر مجھے سوچنا پڑ گیا۔ کیا خبر وہ کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہو جو میرے لیے جاننا ضروری ہو۔ میرے شوہر سرور فراخ دل آدمی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر کو وہ بھی جانتے تھے۔ انہی سے اجازت لے کر میں نے ان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا، مگر اس حادثے کے

بعد موقع ہی نہ مل سکا۔“

مجھے یہ عورت حد درجہ مکار لگی۔ وہ محض جائداد سے کچھ حصہ ملنے کے لیے ہی یہاں آئی تھی یا پھر ایس ایچ او کے دباؤ پر۔

”تو گویا تمہیں ڈاکٹر مظفر سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔“ مختار نے اس کی طرف تیزی نظروں سے گھورنے کے بعد پوچھا۔

”نہیں۔“ بیگم سرور نے فوراً نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔

”ہمم.....“ مختار علی نے ایک ہمکاری بھری۔ پھر اس کے ملازم قدیر کی جانب متوجہ ہوا۔

”تم کبھی ڈاکٹر مظفر کے پاس آئے؟“

”نہیں جناب!“ قدیر نے جواب دیا۔

چند لمبے خاموشی سے بیت گئے۔ پھر اس نے کلینک کے اینڈنٹ اور پرانے ملازم کمال شاہ کی جانب روئے سخن پھیرا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں اس کے گھر اور کلینک کو کھلا چھوڑ کر.....؟“

سب کی نظر میں بیک وقت ہی لامحالہ ادھیڑ عمر اور مضبوط تن و توش کے شخص کمال شاہ کی طرف اٹھ گئیں۔ جو ہم میں سب سے زیادہ چپ چاپ بیٹھا اور غمگین نظر آ رہا تھا۔

بولتا۔ ”میری تو دس سالہ محنت، وقاداری اور خبرداری پر جیسے اس مردود خوئی قاتل نے پانی پھیر ڈالا۔“

”صرف مقصد کی بات کرو اور جذباتیت چھوڑو۔“ مختار علی نے سخت لہجے میں کہا۔ کمال شاہ بولا۔

”حقیقت یہی تھی کہ..... میں اپنے کمرے سے نکلا اور کلینک والے پورشن میں آکر صفائی کرنے لگا۔ وقت سے پہلے ہی میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور اپنی جگہ پر ہر شے کو رکھ دیا کرتا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر میں مطمئن تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے سے نکل کر کلینک میں آئیں گے اسی لیے میں ذرا دیر کے لیے نیم اور بید مشک کے پتے توڑنے باہر چلا گیا۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی اور لوٹا تو یہ ماجرا میرا منتظر تھا۔“

”تمہیں اتنی دیر ہو گئی تھی؟“ مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔

”دیر کہاں ہوئی تھی سرکار؟“ وہ بولا۔ ”اتنی دیر تو میرا اس وقت کا معمول ہوتا ہے۔ مگر یہ سب جو ہوا وہ بہت جلدی ہو گیا تھا۔“

ہیلے ہاتھ

اوقات میں پڑھا کرتا تھا، وہ سب میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ کیا اس کے انجانے خوف کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ ایسی کسی مجرمانہ سرگرمی میں کسی کے ساتھ ملوث تھی۔ وہ خوف یہ تھا کہ بعد میں وہ جرم آشکارا ہونے پر میں اس سے بدل ہو جاؤں گا۔ وغیرہ۔

”شاید اس وقت کوئی کار یہاں سے واپس جا رہی تھی۔“ میں نے بھی غیر ارادی طور پر جھوٹ بول دیا۔ تاکہ نگینہ کے دیے ہوئے جھوٹے بیان کو تقویت مل سکے۔ اس وقت میرے دل و دماغ میں صرف نگینہ کا خیال تھا۔

”اور..... ممکن ہے کہ کوئی میرے قریب سے گزرا ہو اور میں نے توجہ نہ دی ہو۔“

”لیکن اس سے پہلے تو تم نے حتمی لہجے میں کہا تھا کہ کوئی تمہارے قریب سے نہیں گزرا؟“ انسپکٹر مختار علی کی آنکھیں سبز گئیں۔

”ہوں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”دراصل ابھی غو کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ مجھے یہ بات اتنے یقین سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔“

مختار کچھ سوچتا بن گیا۔ نگینہ میری جانب کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے مکان کے باہر لان اور گاڑیوں کی گزرگاہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ لاش اٹھائی جا چکی تھی اور ایک ایسی آئی تصویر کشی کے لیے سامان سیٹ کر رہا تھا۔ میں ایک لمبے ٹیک ادھر دیکھتا رہا پھر دوسری جانب مڑ گیا۔ نگینہ اس وقت دل مراد کی کار میں تھی۔

”میرے پیچھے آؤ۔“ دل مراد نے کہا۔ ”میں نے انسپکٹر مختار سے کہہ دیا ہے کہ فی الوقت تم ہمارے پاس قیام کرو گے۔“

☆☆☆

دل مراد کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ماحول دیکھ کر مجھے کسی اُجڑے ہوئے فلمی گیت کا گمان ہوا۔ وہاں لمبی لمبی راہداریاں، مکان کے بیرونی حصے سے عقی حصے تک چلی گئی تھیں۔

دل مراد مجھے یہاں کیوں لایا تھا؟ اس لیے کہ میں پولیس کی تفتیش سے بچا رہوں کہ کہیں وہ مجھے تھانے ہی میں نہ لے جائیں یا پھر وہ جان گیا تھا کہ مجھے ان دونوں بہن بھائیوں پر کسی گناہ نے جرم کی منصوبہ بندی پر شبہ ہو چکا ہے،

اس کی بات میں وزن تھا۔ اس کے بعد انسپکٹر مختار نے ڈاکٹر کے وکیل کو بولنے کا موقع دیا۔

اس نے وصیت کے مطابق بتا دیا کہ ڈاکٹر کی جائیداد دو حصوں میں منقسم ہوگی۔ ایک اس کی طلاق یافتہ بیوی کے نام اور دوسری ایک ٹرسٹی ادارے کے نام، جن کے کئی خیراتی اسپتال شہر اور شہر سے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ طلاق کے بعد ڈاکٹر نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

سب سے آخر میں انسپکٹر مختار نے نگینہ سے سوال کیا۔ ”مس نگینہ! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ڈاکٹر مظفر سے ملنے آپ کیوں آئی تھیں؟“

میں اور دل مراد، نگینہ کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ نگینہ کی آنکھوں میں خوف سا اُترا ہوا تھا اور دل مراد کا چہرہ بھی لمحہ بھر کو بیت سا بن گیا تھا۔

نگینہ نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولی۔ ”میں..... میں ڈاکٹر مظفر کے پاس اکثر اپنے علاج کے لیے آیا کرتی تھی۔ وہ ہمارا عاقلی طبیب (فیلی ڈاکٹر) تھا۔“

”بہت خوب؟“ مختار نے کہتے ہوئے یوں سر ہلایا جیسے اس کے جواب پر کوئی طنز کرنا چاہتا ہو۔ بولا۔ ”جب تم یہاں پہنچی تھیں تو خواب گاہ میں روشنی ہو رہی تھی۔ تم نے ڈاکٹر کو آواز دی، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تم کچھ دیر انتظار گاہ والے کمرے میں جا بیٹھیں اور پھر اُٹھ کر جانے لگیں تو تمہارا یہ دفتری سامی جاوید آن دھمکا۔ یہی بات ہے؟“

”جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی تھا۔“

حسب توقع اب مختار میری جانب متوجہ ہوا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ ڈاکٹر کی طرف آتے وقت تمہیں راستے میں کسی کی جھلک نظر نہیں آئی تھی؟“

”میں.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ نگینہ نے جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ وقت کافی ہو چکا تھا، یہ محض چند سیکنڈوں کی بات نہیں تھی۔ کیا نگینہ بھول گئی تھی۔ پھر میں نے تو دستک بھی دی تھی جو یقیناً نگینہ کے کانوں تک تو پہنچی ہی ہوگی۔

اس وقت وہ عمارت سے قریب ہی چھپی ہوئی تھی، جہی تو فوراً میرے سامنے آگئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے نگینہ کے اس ذرا سے غلط بیان پر ساری سچویشن ہی تبدیل ہو چکی ہو۔

تب یاک ایک مجھے یوں لگا جیسے نگینہ بھی اس قتل میں ملوث ہے، میں دل گیا۔ جاسوسی کہانیاں جو میں فارغ

میں نے نگینہ کی محبت میں ان کا ساتھ دیا اور اب وہ مجھے بھی اس گھناؤنی منصوبہ بندی میں شریک بنانا چاہتے ہوں؟ زمین و جانداد کے مسائل تو یہاں کی عام بات تھی۔

میرے ذہن میں یہ سب چند سیکنڈ تک چلتا رہا اور وہ تمام اسرار و سراغ کی جاسوسی کہانیوں کے پلاٹ بھی جن میں یہی سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ ہیر و آخر میں مجھدار میں جا پہنستا تھا کہ قانون کو حقیقت سے بے خبر رکھے یا پھر اپنی محبوبہ کو دار پر چڑھا دے۔ میں نے سر جھٹک دیا۔

کمرے کشادہ تھے۔ مہاگنی کے آبنوی رنگت فرنیچر سیت آسائش کا جملہ سامان وہاں نظر آتا تھا۔ وہاں ہر وہ شے موجود تھی جو ایک مکمل اور پُر آسائش گھروں حویلیوں میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے غیر استعمال شدہ نظر آ رہا تھا۔

یہ احساس مجھے اس گرد و گرد کچھ کر نہیں ہوا تھا جو فرنیچر یا دوسری اشیا پر جمی ہوئی تھی بلکہ کوئی اور وجہ تھی جس کی توجیہ کرنا فی الوقت میرے اختیار میں نہ تھا۔

”آؤ نشست گاہ میں چلتے ہیں۔“ دل مراد نے کہا۔ نگینہ بھی ساتھ تھی۔ ”ایک کپ کافی پینے کی حاجت محسوس ہو رہی ہے۔“

”میں بنا کر لاتی ہوں۔“ نگینہ اٹھنے لگی مگر دل مراد نے اسے روک دیا۔ ”مجھے یوں لگا جیسے نگینہ وہاں میری موجودگی کے سبب نہیں رکنا چاہ رہی ہو، مگر کیوں؟“

”ہاجرہ کو بلا دو۔“ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو ان کی ادھیڑ عمر پرانی ملازمہ ہاجرہ وہاں موجود تھی۔ وہ بوڑھی اور لاغری تھی لیکن چہرہ پُر وقار تھا۔

”کیا بات ہوئی ہے، پولیس نے تمہیں کیوں بلایا تھا؟ اور میں نے سنا ہے کوئی حادثہ.....“ وہ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ دل مراد نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کچھ نہیں ہوا اماں!“ نگینہ نے کہا۔ ”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”پولیس اس سے کیا پوچھنا چاہتی تھی۔“ ہاجرہ نے دوبارہ پوچھا۔ وہ ان کی پرانی اور جدی پشتی ملازمہ ہی لگتی تھی۔

”کسی نے ڈاکٹر مظفر کو قتل کر دیا ہے۔“ دل مراد نے انکشاف کیا۔

”کیا.....؟“ ہاجرہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے غیر یقینی کے عالم میں باری

باری دل مراد اور نگینہ کی طرف دیکھا اور میری جانب بھی۔ پھر پوچھا۔

”یہ..... کب کی بات ہے؟“ ”سہ پہر کے بعد کسی وقت کی۔“ دل مراد نے کہا۔

”ہائے خدایا! ڈاکٹر مظفر... فرشتہ صفت انسان تھا، سب کے کام آیا کرتا تھا، آندھی ہو یا طوفان، کوئی بھی بیمار پڑتا بلانے پر فوراً ساتھ چل پڑتا تھا۔“ ہاجرہ گہرے تاسف سے بولی۔ پھر پوچھا۔

”پولیس کیا کہتی ہے؟ کس مردود کی یہ حرکت ہو سکتی ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ اس بار نگینہ نے کہا۔ میں دُزدیدہ نظروں سے کبھی نگینہ اور کبھی دل مراد کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

”مارا کیسے اس غریب کو گئی بیٹی؟“ میں نے محسوس کیا کہ جیسے نگینہ کو بتاتے ہوئے دقت ہو رہی ہوتا ہم بولی۔

”کسی نے ہماری چیز سے ڈاکٹر کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو ضرب لگائی اور پھر لاش کو تالابی جھیل میں پھینک دیا تھا۔ قاتل کا خیال تھا کہ لاش دریا کی شاخ میں جا بیٹھے کٹے گی مگر اتفاق ہی تھا کہ..... وہاں یہ آن پہنچے۔“ کہتے ہوئے نگینہ نے میری جانب اشارہ کر دیا اور مجھ سے نگاہیں چرائیں۔

ہاجرہ نے کچھ مشتبہ انداز کی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

”تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“ ”میں..... وہ.....“

”اپنی طبیعت دکھانے گئے تھے۔“ میں ابھی یہ سچ بتانے ہی والا تھا کہ نگینہ نے یک دم جھوٹ بولا۔ پھر اسے کافی کے لیے بھیج دیا۔ تاکہ وہ مزید سوالات نہ کرے۔

جھوٹ پر جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جا رہا تھا مجھے آخر کس مقصد کے لیے..... وہ شاید اب یہ دونوں بہن بھائی میرے سامنے کھولنے والے تھے۔

میں بھی اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر ان دونوں بہن بھائیوں کا اس میں ہاتھ ہو تو کیا میں ان کا ساتھ دے سکتا ہوں؟

ابھی میرے پاس اپنے ہی اس سوال کوئی جواب نہ تھا، خیر وقت ضرور تھا۔

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے اور باتیں

کرنے کے بعد ہم سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ دادا بہت ضعیف تھے، ان کی لگی بندھی روٹین تھی۔ وہ الگ تھے اور ہاجرہ ہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

”تم اب اس وقت گھر جا کر کیا کرو گے وہاں کون سے تمہارے اپنے بیٹھے منتظر ہوں گے۔ یہیں رک جاؤ، کل صبح دوبارہ تو آنا ہے، بیان وغیرہ کے سلسلے میں؟“

میں نے جب دیکھا کہ دونوں بہن بھائی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کر رہے ہیں تو اپنے خیال کو رد کرتے ہوئے میں رخصت چاہنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جواب میں دل مراد نے مجھ سے یہ کہا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ کہاں تو مجھے یہ شخص پسندیدگی کی نگاہ سے ہی نہیں دیکھتا تھا اور اب..... جیسے اس کا رویہ نرم ہوا جا رہا تھا۔

”ہاں، بھائی صبح کہہ رہے ہیں۔ آپ رک جائیں نا۔ اتنی رات ہو گئی ہے اور یہ سارا جنگلی علاقہ ہے۔“ نگینہ بھی بھائی کی دیکھا دیکھی بولی۔

ایک بار پھر تجسس نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ ان کا کہنا ٹھیک ہی تو تھا۔ ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو فلیٹ میں میرا کون پیچھے انتظار کرنے والا بیٹھا تھا بھلا؟ ماسوائے جاسوسی ناولوں کے ڈھیر اور کتابوں کے۔ رہی بات ڈیوٹی کی تو وہ میں فون پر اپنے سیکشن انچارج کو قانونی مجبوری بتا کر چھٹی لے سکتا تھا۔

مجھے کمرادے دیا گیا۔ میں جب بستر پر لیٹا تو خود کو کسی سنسنی خیز جاسوسی کہانی کا ایک کردار ہی سمجھتے ہوئے تھا۔ شاید مرکزی کردار..... یا پھر..... یا پھر.....

”قربانی کا بکرا.....“ کسی نے سرگوشی کی اور ایک انجانے خوف تلے میرے پورے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔

ایسے میں میری چشم تصویر میں اسٹڈی کی ہر چیز گویا سامنے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جہاں سے ہم کچھ دیر پہلے اٹھے تھے۔ وہاں پر سجا ہوا فرنیچر، مکان تمام اشیاء سے ممتاز تھا۔

”میں نے یہ کمر اپنے اور مراد بھائی کے لیے سجایا تھا۔“ نگینہ کی آواز میرے دماغ میں گونجنے لگی۔

مجھے دانش روم کی حاجت ہوئی اور میں جب فارغ ہو کے دوبارہ بستر کی جانب بڑھا تو مجھے کسی کی تیز آواز سنائی دی، یوں جیسے کوئی غصے یا جھگڑا کے تیز آواز میں بولا ہو۔

یہ آواز نگینہ کی تھی۔ میں چونک گیا۔ آہستگی سے

دروازے کی جانب بڑھا اور اسے کھول کر راہداری میں آگیا۔ پر اپنا گھر تھا، اس طرح جاسوسی کرنا مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن نگینہ کی آواز نے مجھے بے چین کر دیا تھا اور کچھ میں اپنے سابقہ خدشات کے سبب ایک تجسس کا بھی شکار تھا۔ راہداری میں مدھم روٹنی ہو رہی تھی۔ اب باتیں کرنے کی آواز ہلکی ہو گئی، جو اسٹڈی روم سے آرہی تھی جہاں ہم کچھ دیر پہلے بیٹھے تھے۔

تو کیا وہ دونوں بہن بھائی ابھی تک وہاں موجود ہیں؟

”ہرگز..... ہرگز نہیں..... میں یہ شادی کسی بھی صورت میں نہیں کر سکتی۔ میں صرف اور صرف جاوید کو پسند کرتی ہوں اور اسی سے ہی شادی کروں گی، کان کھول کر سن لو، اگر کسی نے مجھے پردباؤ ڈالنے کی کوشش چاہی تو میں یہ راز سب کو بتا دوں گی۔ سمجھتے تم؟“

میں ابھی دروازے سے کان لگائے ہوئے ہی تھا کہ مجھے نگینہ کی براہم ہوتی یہ آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کرسی کے زور سے ٹھکنے کی بھی۔

میں جلدی سے اپنے کمرے کی جانب لوٹ آیا اور دروازے کی جھری بتا کر نیم تاریک راہداری میں دیکھنے لگا۔ نگینہ نکل کر دوسری جانب چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے بھائی دل مراد کو بھی کمرے سے نکلتے دیکھا۔

اب خاموشی چھا گئی۔ میں دوبارہ بستر پر آکر دروازہ ہوا گیا۔ میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔

ان دونوں بہن بھائیوں کے بیچ مجھے کسی پراسرار معاملے کی بھنک محسوس ہوئی۔ وہ آخر اپنی بہن نگینہ پر کس سے شادی کرنے کا دباؤ ڈالنے کی کوشش میں تھا؟ اور..... اور نگینہ کی یہ تہدید بھی میرے ذہن میں گونجنے لگی، جو اس نے اپنے بھائی کو دیتے ہوئے کہی تھی کہ اگر اس پر زیادہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی تو وہ کوئی راز اگل دے گی۔

آخر وہ کیا راز تھا؟

ساتھ ہی مجھے نگینہ کی زبانی یہ سن کر بھی مسرت ہوئی تھی کہ وہ صرف مجھ سے ہی شادی کرنا چاہتی تھی اور اب تو اس نے گویا بانگ دہل اپنے بھائی سے بھی یہ کہہ دیا تھا۔

خوشی اپنی جگہ مگر پھر وہی بات میرے ذہن گردش کرنے لگی یہ دونوں بہن بھائی کسی خونی سازش میں ملوث ہیں، لیکن پھر مجھے کم از کم نگینہ کے سلسلے میں کسی قدر تسلی ہوئی کہ وہ اگر خدا نخواستہ کسی دباؤ یا مجبوری کے سبب اپنے بھائی کے ساتھ کسی سازش میں شریک ہے بھی تو کم از کم وہ میری

میلے ہاتھ

پہلی گئی تو دل مراد مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔
اچانک اس نے مجھ سے باہر آکر، جب میں اپنی
بائیک سنبھال رہا تھا، ایک غیر متوقع جملہ کہا۔
”کیا تم گینے سے محبت کرتے ہو؟“
لاحالہ میں نے چونک کر پہلے اس کی طرف دیکھا پھر
مسکرا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا تو
نہیں؟“

”وہ ایک خطرناک ذہنی مریض ہے۔ وہ اپنے ایک
اور چاہنے والے کو بھی جانی نقصان سے دو چار کر چکی ہے۔
وہ طویل عرصے سے غائب ہے، شاید مار دیا گیا ہے۔ تم محتاط
رہنا۔“

”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اُلجھ
کر کہا۔

”میں صرف تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گینے کی منگنی ہو
چکی ہے۔“ یہ اطلاع میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔
”لیکن، اس نے تو کبھی مجھے یہ نہیں بتایا؟“

”میرے یہ بتانے کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ تم اس
کا خیال دل سے نکال دو۔ کیونکہ گینے کا مگنیہ تر کھیل بھی ایک
حادثے میں مر چکا۔ خدا حافظ!“ وہ انتہائی رکھائی سے بولا
اور پلٹ گیا۔

میں ابھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا۔ اپنی تعمیر آمیز
طبیعت سے مجبور ہو کر جی تو چاہا کہ اسی وقت اندر جاؤں اور
گینے سے اس بات کی تصدیق کر ڈالوں۔ پھر یہ سوچ کر کہ
دل مراد نے یونہی جھوٹ بولا ہو گا۔ گینے سے پھر کبھی
دریافت کر... لوں گا۔

میں واپس ہوا تو سوچا ابھی وقت ہے، ڈیوٹی پر ہی
کیوں نہ چلا جاؤں۔

لہذا وہاں سے میں بائیک خاصی رفتار سے دوڑاتا ہوا
ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ اپنی لیو (چھٹی) کینسل کروائی، بائیو میٹرک
پر حاضری لگائی اور سیٹ پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

سچی بات تھی کہ دفتر میں میرا دل ہی نہ لگا مگر چارو
ناچار کام کرتا رہا۔ شام میں گھر پہنچا تو گینے کی کال آگئی۔

میں خود بھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔
”کہو، خیریت ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
جانے کیوں میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

”تم ہمارے گھر سے واپسی پر ڈیوٹی پر چلے گئے
تھے؟“

دشمن نہیں ہو سکتی۔ ورنہ وہ اپنے بھائی کو یہ حقیقت کیوں بتاتی
کہ وہ اگر شادی کرے گی تو صرف مجھ سے ہی۔

اب مجھے ایک بے چینی لگ گئی۔ میں نے سوچا گینے
سے کھل کر بات کروں۔ اس طرح کہ اسے بُرا بھی نہ لگے
اور وہ کسی قسم کے خوف کے بغیر مجھے ساری حقیقت سے آگاہ
بھی کر دے۔ مجھے یوں لگا جیسے گینے کو میری مدد کی ضرورت
ہو۔

رات گئے میری آنکھ لگ گئی۔
صبح جب ہاجرہ ہی مجھے جگانے کے لیے آئی تھی تو اس
بوڑھی خاتون کو ملازمہ کو دیکھ کر کایک میرے ذہن طہار میں
ایک خیال آیا اور میں نے اس سے کہا۔

”اماں! آپ اس خاندان کی پرانی اور کافی خیر خواہ
ملازمہ لگتی ہیں۔“ وہ میرے نرم لہجے پر سمجھ گئی۔

”ہاں، بیٹا! یہ دونوں تو میری گودوں میں کھیلے
ہیں۔“ اس کی مراد یقیناً گینے اور دل مراد سے تھی۔

”کیا گینے کو ڈاکٹر مظفر نے... بلایا تھا یا پھر وہ خود
وہاں گئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کل جیسے
آپ نے یہ بات بتائی تھی مگر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔“
”ہاں۔“

”کیوں، کیا علاج کے سلسلے میں؟ لیکن مجھے گینے نے
بھی بتایا تھا کہ وہ کوئی خاص بات اس سے کرنا یا بتانا چاہتا
تھا۔“ میں نے اب تک کی صورت حالات اور گفتگو کی روشنی
میں اندر میرے میں تیر چلایا۔

”شاید وہ ہمارا پہلی ڈاکٹر ہے اور بہت ساری باتوں
سے واقف بھی۔“ ہاجرہ بولی۔

میں جو اپنے ذہن رسا میں تانے بانے بن رہا تھا اس
کے مطابق ہی ہاجرہ نے جواب دیا تھا۔

”کیسی باتیں؟“

”میں کیا جانوں، آؤ ناشتے پر سب موجود ہیں۔“

وہ چلی گئی۔ میں ہونٹ بھیچے کچھ سوچتا رہا۔
ناشتہ ہم نے اگلے ہی میز پر کیا۔ دونوں بہن بھائی

خاموش خاموش تھے۔ فقط دل مراد نے ایک جملہ ادا کیا تھا
کہ ناشتے کے بعد ہو سکتا ہے، الیکٹرک ٹی وی یہاں آجائے۔

ناشتے کے بعد ہم اس کے فکھر رہے، جب وہ نہ آیا
تو... گینے کے کہنے پر دل مراد نے اس سے فون کر کے
پوچھ لیا۔

اس نے شام کو آنے کا کہا تھا۔ میں ان سے رخصت
ہونا چاہتا تھا۔ گینے طبیعت خرابی کا کہہ کر اپنے کمرے میں

”ہاں، مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”یونہی، میرا اندازہ تھا، تم ڈیوٹی کے موٹ ریکوئیر اینڈ پنکچوئیل ملازم ہو۔“ وہ جیسے مسکراتے لہجے میں بولی۔
”اس حسن ظن کا شکریہ لیکن مجھے تم سے..... کچھ ضروری بات کرنا تھی۔“

”بعد میں“ ابھی جلدی میں ہوں، اپنا خیال رکھنا ہو جائے۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے بے چین ہو کے دوبارہ ملانے کی کوشش چاہی مگر دوسری جانب سے اس کا سیل آف جارہا تھا۔
”عجیب لڑکی ہے یہ بھی.....“ میں جھٹلا کر سیل بیڈ پر پھینکتے ہوئے بولا۔

اسے شاید معلوم تھا کہ میں دوبارہ اس سے رابطہ کروں گا۔ پر ایسا کیوں کرتی ہے یہ؟ کیا یہ واقعی ذہنی مریضہ ہے؟

تب ہی مجھے اس کے بھائی دل مراد کی تنبیہ یاد آئی کہ وہ اپنے کسی اور چاہنے والے کو بھی جانی نقصان سے دوچار کر چکی ہے۔

پھر مجھے اس کی اور ایک بات کا بھی خیال آیا، نگینہ کی معنی ہو چکی تھی، لیکن منگیتر ٹکلیل کسی حادثے میں مر چکا تھا۔ اس کا وہ چاہنے والا کون تھا جو عرصہ ہوا پراسرار طور پر غائب ہو چکا تھا، پا کر دیا گیا تھا اور یہ قول دل مراد کے ہی اس میں نگینہ کا ہی دخل تھا۔

”جھوٹ..... بکواس، وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح میرا دل نگینہ سے خراب ہو جائے گا۔ دل مراد خود بدنیت آدمی ہے۔ میں اس سلسلے میں نگینہ سے تفصیلاً بات کروں گا۔“ میں نے تہیہ کر لیا۔

سہ پہر کو دل مراد نے فون کر کے مجھے آنے کا کہا۔ میں تو تیار بیٹھا تھا۔ بانیگ سنبھالی اور روانہ ہو گیا۔

وہاں انسپکٹر مختار علی موجود تھا۔ اس نے وقوعہ سے متعلق کچھ معنی اور سرسری سوالات کیے، پھر چلا گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ بھی بس، ضابطے کی ایک روایتی کارروائی نمٹا رہا تھا۔

اسی وقت بارش شروع ہو گئی مگر یہ ہلکی بوند باندی تھی، کچھ دیر میں رک گئی۔ میری داپسی میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ میں رک گیا۔

نگینہ سے ابھی تک مجھے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔

شام کی چائے ہم نے باہر لان میں بیٹھ کر پی۔ دل

مراد غائب ہو گیا تھا۔ تب ہی میں نے نگینہ سے وہ ساری بات کہہ ڈالی جو اس کے بھائی دل مراد نے مجھ سے کہی تھی، البتہ ابھی وہ رات والی بات نہیں کہی تھی، اس کے لیے میں موقع کا منتظر تھا۔

”یہ سچ ہے۔“ نگینہ نے اعتراف کیا اور اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ انکار کر دے گی اور کہے گی کہ اس کے بھائی نے یہ سب جھوٹ کہا ہے۔
”تو پھر تم نے مجھ سے اتنی بڑی حقیقت چھپائی کیوں؟“ میں نے شکوہ کنال ہو کر کہا۔
”کیا فائدہ تھا اس کا؟“

”کیا فائدہ تھا؟“ میں نے ہونق سا بن کر کہا۔
”تمہاری معنی ہوئی پھر منگیتر ٹکلیل کا حادثے میں مرنا پھر اس کے بعد، تمہارے کسی چاہنے والے کا اچانک اور پراسرار غیب، اور تم کہہ رہی ہو کہ میرے لیے یہ جاننے کا کیا فائدہ؟“

”بھائی دل مراد کو بہر حال تم سے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی، اس نے تمہارا مجھ سے دل خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔“ وہ بولی۔

”نگینہ! میرا تم سے دل خراب کبھی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ سب کیا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، مجھے پلیز، حقیقت تو بتا دو، یہ آخر کیا معاملہ ہے معنی اور چاہنے والا.....“ میں واقعی پریشان سا ہو گیا تھا۔

وہ بولی۔ ”میرے چاہنے والے اس دنیا میں صرف دو ہی آدمی ہیں، ایک مر چکا، دوسرا تم ہو۔ لیکن اس میں ایک فرق ہے، پہلا شخص جو مر چکا، اس سے مجھے محبت تھی ہی نہیں، وہ میرے گھر والوں کا فیصلہ تھا، اس وقت تم سے میری ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک حادثے میں مر چکا ہے۔ پھر کوئی عزیز خان نام کا آدمی تھا اسے میں نے گھاس نہ ڈالی۔ مگر دو روز بعد ہی وہ بھی کہیں ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہ مل سکا۔ گھر والوں کا یہی خیال تھا کہ وہ ایک فراڈ تھا اور کچھ نہیں۔“

نگینہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ دل میں خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ حالات سنبھلے ہوئے تھے۔

”تمہارا منگیتر ٹکلیل حادثے میں کیسے مرا؟“
”اُسے سوئمنگ اور غوطہ خوری کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس نے ایک دریائی پٹی کے کنارے کشتی گھاٹ کے پاس غوطہ خوری کا ٹاؤر بسنایا ہوا تھا، ایک اسپرنگ بورڈ

ہیلے ہاتھ

میں تعریفیں بیان کرنے لگی، پہلے تو مجھے لگا شاید وہ اصل موضوع سے میری توجہ ہٹانا چاہ رہی تاہم اس نے بتایا کہ ان باغات سے انہیں والہانہ محبت ہے۔ ان سے ایک جذباتی تعلق وابستہ ہے ان کے خاندان کا۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بالآخر میں نے اصل بات کی ابتدا کر ڈالی، مگر اس طرح کہ وہ ناراض بھی نہ ہو اسی لیے سب سے پہلے میں نے اس کی بیماری کے متعلق سوال کیا۔

”تم نے ابھی تک وضاحت سے کچھ نہیں بتایا کہ تم اچانک مجھ سے رابطہ کیوں توڑنا چاہتی تھیں، خط و اس ایپ کرنے کے بعد تم نے سیل فون ہی بند کر دیا تھا؟ کیوں؟“

”میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“

”کیا؟“

”یہی کہ میں ذہنی طور پر بہتر نہیں ہوں۔“ نگینہ نے عجیب لہجہ میں کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ کیا تم کسی ماہر نفسیات کے پاس گئی ہو؟“

”نہیں، کبھی نہیں۔ ڈاکٹر مظفر کے پاس بھی میں صرف طبیعت کی خرابی کے لیے جاتی تھی۔“

”لیکن.....“

”پلیز، جاویدا! میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔“ اس کا لہجہ ایک دم سرد ہو گیا اور اس نے میری بات کاٹ دی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ ایک دم خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ کیا وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی؟ میرے دل میں ہل بھر کے لیے خیال آیا۔

”نگینہ!“ میں نے پیار سے اُسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اگر تم بیمار ہو تو کسی ڈاکٹر کے پاس ضرور جاؤ۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے پھول کیاریوں اور درختوں کے قریب قریب چلنے لگے۔ چاروں طرف پھولوں کی تیز اور یو جھل خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ نگینہ جھیل کی جانب سے مڑ کر اب تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ میں بھی تیز چلنے لگا اور اسے پکارا۔

”سنو..... میں تم سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

میری بات پر نگینہ رک گئی۔ پھر ایک بیچ پر بیٹھ کر سکیاں لے کر رونے لگی۔

”یہ بتاؤ تم نے کل اسپیکر معیاری سے جھوٹ کیوں

بھی، غوطہ خوری کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا، چپ لگاتے ہوئے اس کا سراپہ رنگ بورڈ سے لکرایا۔ اگلے دن اس کی لاش پول کی تہ سے برآمد ہوئی تھی۔“

”اوہ، ویری سیڈ۔“ میرے منہ سے نکلا۔ اس کے بعد میں نے اس رات والے حوالے سے بات کی تو ایک دم نگینہ کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔

”خدا کے لیے مجھ سے یہ راز پوچھنے کی خدمت کرنا جاویدا!“ اس نے روہانے انداز میں منت کر ڈالی۔ ”بس، تمہیں میری محبت اور بات کا یقین تو آ گیا ہے نا کہ میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں اور تم ہی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے نگینہ!“ میں نے محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل کی عین گہرائیوں سے کہا۔ ”لیکن نگینہ! مجھے یہ سب ایک ڈراما ہی لگتا ہے، جس کا انجام مجھے خوف ناک نظر آ رہا ہے۔“

”کیسا ڈراما؟ کیسا انجام؟“ وہ ڈر گئی۔

”یہی کہ ڈاکٹر مظفر کا قتل اور تم پر شادی کا دباؤ۔“

”مجھے پر شادی کا کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا۔“ وہ بولی۔

”رہا ڈاکٹر کا قتل تو وہ پولیس کا کام ہے قاتل کو تلاش کرے، ہم تو صرف ضابطے کی کارروائی کے مطابق تفتیش کے دائرے میں ہیں اور بس۔“

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ چپ رہی۔

اسی دوران بارش پھر شروع ہو گئی۔ ہم لان میں ایک جمجھے تلے کرسیاں لگائے بیٹھے تھے۔ بادل گرج رہے تھے۔ ایسے میں مجھے واپسی مشکل لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے آج بھی یہیں رکنا پڑے گا۔ تاہم میں نے محسوس کیا تھا کہ نگینہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی کہ میں آج رات یہیں رک جاؤں۔

مجھے بھی اس سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اور بھی کئی سوالات جو ڈاکٹر مظفر کے پراسرار قتل سے اور نگینہ سے ہی متعلق تھے، وہ پوچھنا تھے۔

اسی وقت بارش رک گئی۔ ہر طرف سہانا موسم طاری ہو گیا۔

”چلو باغات کی سیر کے لیے نکلتے ہیں۔ بارش رک گئی ہے۔ تمہیں اپنے باغات دکھاؤں۔“ ایکایک نگینہ بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور ہم تھوڑا آگے چلے تو نگینہ ان باغات کی بڑے عجیب انداز

”بولا تھا؟“

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور میری طرف نکلنے لگی۔ حالات ایسے تھے کہ مجھے تھوڑا بہتر دل ہونا پڑا۔ اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ تھا۔

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، اس وقت جو میرے ذہن میں آیا وہ کہہ دیا۔“

”ٹھیک ہے، میں خود ان باتوں کی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“

اس نے چونک کر پھر میری طرف دیکھا۔ ”تم..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تم نے کہا تھا کہ جب تم ڈاکٹر کے پاس پہنچی تھیں تو وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ جب تم واپس آ رہی تھیں تو مجھ سے ملاقات ہو گئی۔“

”یہ درست ہے جاویدا“ وہ بڑے رसान سے بولی۔

”لیکن میں تمہارے پکارنے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ یہ وقت تم نے کہاں گزارا تھا؟“

”میں جھیل کے پاس تھی، اس تذبذب کا شکار تھی کہ شاید ڈاکٹر واپس آجائے، تمہاری بایک کو دیکھ کر میں اُجھن میں پڑ گئی تھی، حتیٰ کہ بعد میں، میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“

”تھیں..... کیا تم ڈاکٹر کے قاتل سے واقف ہو؟“

”نہیں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔“

”ہوں، تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ اس کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ ”میں کچھ نہیں بتا سکتی۔“

”اس کے باوجود کہ کسی نے اسے قتل کیا ہے۔“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”ڈاکٹر نے تمہیں اپنے گھر کیوں بلایا تھا؟ یا تم کیا واقعی علاج کرانے گئی تھیں اس کے پاس؟“

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرا چہرہ دیکھنے لگی اور لڑکھڑاتے لہجے میں بولی۔

”تت..... تمہیں یہ کس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے مجھے بلایا تھا خاص طور پر.....؟“

میں نے اُس رات ملازمہ ہاجرہ کی زبانی یہ سنا تھا، جب ہم رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ بات ابھی تک میرے ذہن میں اُٹکی ہوئی تھی۔

”مجھے بتاؤ تھیں وہ کیا بات تھی، جو ڈاکٹر تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر اس بے چارے کو قاتل نے موقع ہی نہ دیا؟“

”ممکن ہے کہ وہ میری بیماری کے بارے میں ہی گفتگو کرنا چاہتا ہو۔ جیسے کہ تم کہہ رہے ہو کہ مجھے کسی بڑے اچھے نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔“

اس نے بڑی چالاکی سے بات تھمادی تھی۔ تھیں کو مجھ سے بھی محبت کا دعویٰ تھا، لیکن ایک بے گناہ خون کو ضائع نہیں جانے دیتا تھا۔ انسانیت کے ناتے یہ میرا فرض بنتا تھا جبکہ تھیں کو میں اس میں ملوث محسوس کر رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی جرم میں مجبور یا دباؤ میں آکر ملوث کی جا چکی تھی۔ مگر وہ راز کیا تھا؟ اسی راز میں مجھے ساری قتل کی داستان چھپی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”تمہارے خیال میں کیا ڈاکٹر کی قاتل میں ہوں؟“

اچانک تھیں نے کہہ ڈالا۔ ”جی تو میرا چاہا کہ اُسے جوش دلانے اور ساری حقیقت بتا دینے پر مجبور کرنے کے لیے ہاں کہہ ڈالوں۔ تاہم بولا۔“

”سردست تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ تھیں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ ہم اب باتیں کرتے ہوئے باغات سے باہر دریا کے اس حصے پر آ گئے تھے جہاں ایک چھوٹی سی کشتی گھاٹ بنی تھی۔

”غوطہ خوری کا ٹاور اس جگہ تھا۔“ تھیں نے اشارہ کیا۔ ”کھیل کے مرنے کے بعد دل مرانے اسے ختم کر دیا تھا۔“

قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کہا۔ ”ممکن ہے، کھیل نے خود کو ہلاک کر لیا ہو؟“

”کیا.....؟“ میں چونک کر بولا۔ ”اُسے بھلا خودکشی کی کیا ضرورت تھی؟“

”ممکن ہے اسے بھی وہی بات معلوم ہو جو ڈاکٹر مظفر میرے بارے میں جانتا تھا؟“ تھیں نے نہایت اسرار بھرے اور چونکا دینے والے انداز میں کہا، یوں جیسے اس پر ایک بار پھر ذہنی مریضہ جیسا دورہ پڑنے لگا ہو اور وہ سب سچ بتانے پر مجبور ہو، ایسے میں مجھے خود بھی اس سے خوف آنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”ی کی..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ہوش میں تو ہونا؟“

میں نے پوچھا۔ وہ ایک دم سٹریائی انداز میں چلانے لگی۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم، میں بے گناہ ہوں۔ آہ.....“

وہ نڈھال سی ہو کے گرنے لگی۔ میں اسے گھر لے آیا۔ دل مراد اور ہاجرہ اسے سنبھالنے لگے۔ دل مراد نے کوئی دوا لانے کا کہا۔

میلے ہاتھ

”اچھا، کیا کھیل کی موت کے وقت یہ افواہ اڑی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے؟“ میرا سوال اچانک تھا۔ وکیل کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔

”معلوم نہیں، اس..... سلسلے میں مکمل تحقیقات ہوئی تھیں اور قاتل نہیں مل سکا تھا۔“ وکیل کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ اس کا رویہ اب میرے لیے ناقابل فہم تھا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر مظفر، نگینہ سے کیا بات کرنا چاہتا تھا؟“

”نہیں، وہ اپنے مریضوں کے بارے میں گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا۔“

”غالباً اس کے ہاں طبی ریکارڈ تو ضرور ہوگا۔“

”یقیناً، لیکن وہ سب کچھ انسپکٹر مختار کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ اس نے آرڈرل کی تلاش میں پیشہ ور غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔“

”آخری سوال، کیا تمہیں معلوم ہے کہ عذیر خان کون تھا اور اس کی مشکلی نگینہ کے ساتھ ہوئی تھی؟“

”تم یہ سب آخر کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا پولیس کے منجر ہو یا پھر کوئی اور معاملہ ہے؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”معاملہ مجھے بھی واقعی کوئی اور نظر آ رہا ہے جس کے بارے میں سب جانتے ہیں مگر ظاہر کچھ نہیں کر رہے، میرا سوال درمیان میں رہ گیا۔“ میں نے بھی اپنا لہجہ سپاٹ بناتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کا جواب بھی وہی تھا جو نگینہ مجھے دے چکی تھی۔ تاہم میں سمجھ چکا تھا کہ اس قانون داں سے کوئی بات معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں اس کے عجیب و غریب رویے کے بارے میں غور کرتا ہوا اٹھا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ایک روز بعد جب میں وہاں پہنچا تو مقتل ڈاکٹر مظفر کے گھر کے قریب انسپکٹر مختار علی اور دیگر افرام موجود تھے۔ نگینہ نے مجھے ساتھ لیا اور اس جگہ پہنچی جہاں دوراتیں قبل اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔

”ادہ.....“ نگینہ کانٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا تھا جب اس کا مردہ ہاتھ پانی سے باہر نکلا ہوا تھا اور میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی تھی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں قدیر اور

میں واپس اپنی بانیک کی جانب آیا۔ رات ہو چکی تھی، اس بار دل مراد نے بھی مجھے رکنے کا نہیں کہا بلکہ اس کے انداز سے یہی لگا کہ وہ بھی مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہو۔ میں رات کے اندھیرے میں گھر آ گیا۔ اگلے دن میں نے ایڈووکیٹ مسعود کے دفتر کا رخ کیا۔ وہ اپنی بھاری میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مجھے پہچان کر مصافحے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جاویدا! میں تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت زدہ ہوا ہوں۔“

”نگینہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس کے خاندانی معاملات سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔“ رکی علیک سلیک اور گفتگو کے بعد میں مقصد کی بات پر آ گیا۔

”صرف کاروباری معاملات۔“ مسعود نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا باپ بختیار احمد اور میں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ اُس وقت جاویدا کا سارا حساب میرے والد کے ہاتھ میں تھا۔“

میں نے اس سے نگینہ کی اس پراسرار بیماری کا تذکرہ کیا اور تفصیلات معلوم کیں تو وکیل نے کہا۔

”اس خاندان میں بھی کسی کو خفقان کا مرض نہیں رہا۔ البتہ ان باغات سے سب کو پراسرار انداز میں دلچسپی ضرور رہتی ہے۔ ان سب نے اس بارغ پر اتنی رقم صرف کی ہے کہ کوئی اور تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسے بھی شوق ہی کہا جا سکتا ہے پاگل پن نہیں۔“

”یقیناً۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا ڈاکٹر مظفر نے ان باغات کے بارے میں کوئی دھمکی دی تھی؟“

یہ سوال اگرچہ مجھے خود بھی عجیب لگا تھا مگر مجھے کسی خیال کے تحت کرنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وکیل کے کان ایک دم پھڑکے پھر ساکت ہو گئے۔

”مجھے صرف نگینہ سے دلچسپی ہے۔ مجھے اس کی دولت اور امارت سے کچھ نہیں لینا دینا۔“ اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا غلط مطلب لیتا، میں نے کہہ دیا۔ کیونکہ اسے اسی رات ہی علم ہو گیا تھا جب ہم سب کی انسپکٹر مختار علی کے ساتھ ایک ”تفتیشی“ نشست گئی تھی کہ میں اور نگینہ ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے تھے۔ وغیرہ۔

”نہیں..... ڈاکٹر نے کسی قسم کی کوئی دھمکی نہیں دی تھی اور دیتا بھی کیوں؟ وہ تو ان کا علی طیب تھا۔“

سادہ مزاج آدمی تھا جسے پہلے جان بوجھ کر نشے کی لت میں لگایا گیا پھر آہستہ آہستہ اس سے اونے پونے سب کچھ چھین لیا گیا۔ اب میں وہ ایک ایک پائی ایک دن واپس حاصل کر کے رہوں گا۔ لوگوں نے اس کی بڑک پر کان نہیں دھرے۔ نہ ہی وہ کچھ کر سکا۔

”اس کی کون سپورٹ کر رہا ہے؟“

”کس کی؟“

”قدیر کی؟“

”بھلا اس کی کون سپورٹ کر سکتا ہے؟ وہ خود اب

ایک معمولی حیثیت کا نوجوان ہے۔“

”کیا خبر کوئی اسے اسی کی انتقامی خواہش پر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہو۔ کیونکہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں اس نے دھمکی دی ہے، اس میں تمہارے مرحوم باپ کا نام بھی آتا ہے۔“

میری بات پر نگینہ کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا لیکن ایک دم ہی اس نے جیسے یہ تاثرات زائل کرنے یا چھپانے کی خاطر ایک کھوکھلا سا قہقہہ بلند کیا۔

”تمہیں تو واقعی پولیس میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں، عموماً عاشق ناکامی میں شاعر بن جاتے ہیں مگر میں.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہو سکتا ہے بیگم سرور ہی اس لڑکے کے ساتھ مل کر کچھ کر رہی ہو۔ دروین خانہ.....؟ کیونکہ اس کا دوسرا شوہر سنا ہے، اپنی بیوی سے دبتا ہے اور اس کی حیثیت ”نیس میم“ کے سوا کچھ نہیں۔“

ہم واپس آگئے۔ معلوم ہوا کہ پولیس کو ابھی تک آلہ قتل نہیں مل سکا تھا۔

☆☆☆

بوڑھی ملازمہ مجھ پر اب بھروسہ کرنے لگی تھی۔ وجہ اس کی وہ باتیں تھیں جو میں تنہائی کے موقع پر اُس سے کرتا رہتا تھا۔ ایک چھوٹا موبائل فون اس کے پاس بھی تھا۔ اسمارٹ فون تو وہ نہیں استعمال کر سکتی تھی مگر عام سا چھوٹا سیل وہ کر لیتی تھی۔

ایک دن اس نے مجھے فون پر کہا۔

”پہلے مجھے تم پر شک ہوتا تھا مگر اب تمہاری کوششوں سے تمہارے خلوص اور نئی بیٹی سے سچی محبت کا مجھے یقین ہو چلا ہے۔ تم ایسا کرو نگینہ کو یہاں سے کہیں لے جاؤ۔“

میں اس کی بات پر چونک پڑا۔ یوں لگا جیسے مِل کے مل ہی اس ڈرامے کا ڈرامہ سین ہوا چاہتا ہے۔ مجھے اپنا

کمال شاہ سے بھی ملا ہوں۔“ میں نے اپنی دانست میں اسے چونکا دیا۔ میرے ایک مہم سے خدشے کے مطابق اگر وہ مجرم نہیں تھی تو اس بات پر قطعاً نہیں چوکنے کی اور وہی ہوا۔ ”اچھا، تم نے پولیس والوں جیسی تفتیش شروع کر دی۔“ وہ پہلی بار ان حالات میں بھی ہنسی لگی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ نگینہ اور دل مراد دونوں ہی معصوم تھے، یا پھر کوئی اور معاملہ تھا۔

”مجھے پلیز، ذرا قدیر کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”تم مل تو آئے ہو؟“

”ہاں، مگر ماسوائے عمومی باتوں کے۔“

”میں جانتی ہوں جاویدا کہ تم یہ سب تک دو میری خاطر کر رہے ہو۔ مطمئن رہو، تمہاری نگینہ کسی طرح بھی مجرم نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں شکایت نہیں تھی ایک پیار تھا، ایک مان تھا۔

”ہاں، نگینہ! تم ٹھیک سمجھی ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو، مجھے تم پر بھروسہ ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ قدیر کے بارے میں بتانے لگی۔ حقیقت یہی تھی کہ قدیر نے مجھے کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی۔

قدیر سے میرا ملنا غیر ضروری تھا اسی لیے میں نے سب سے پہلے کمال شاہ سے ملاقات کی تھی اس نے جو انکشافات قدیر کے بارے میں کیے تھے، اس کی بنا پر میں قدیر سے ملتا تھا مگر اس نے مجھے کوئی رخ نہ دیا اور اُلٹا مجھ پر طنز کرنے لگا تھا کہ میں..... نگینہ کو اس کی دولت و جائیداد کی خاطر پسند کرتا ہوں، وہ بیگم سرور کا خاصا منہ چڑھا ملازم تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ نگینہ، قدیر کے بارے میں مجھے کیا سچ جھوٹ بتاتی ہے۔ وہ مجھے قدیر کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”سننے میں یہی آتا ہے کہ بہت عرصہ پہلے قدیر کے باپ دادا کی یہاں بڑی زمینیں تھیں، جہاں اب ہماری ہیں۔ قدیر جو کہ اب معمولی ملازم ہے گھر کا کبھی صاحب جائیداد ماں باپ کی اولاد ہوا کرتا تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ ان کے ہاتھ سے یہ سب نکلتا چلا گیا۔ باپ نشے کا عادی ہو گیا اور جرائم کی راہ پر تھانے کچہریوں میں سب گنوا بیٹھا۔ قدیر کی ماں خود کو تب بھی معزز اور جاگیردارنی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن شوہر کے پاس اب دکھاوے کو پورا کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔

قدیر جوان ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ اس کا باپ

صیلے ہاتھ

کے سامنے آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس آدمی نے ایک طویل سانس لی۔

”اوہ، یہ تم ہو۔“ دل مراد کی آواز سنائی دی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم آج نہیں آؤ گے۔“

”حالات ہی ایسے ہیں کچھ کہ مجھے روز آنا پڑے گا۔“ میں نے بھی ڈھٹائی سے کہا۔ آخر کو نگینہ میری محبت تھی۔ میں اسے خطرات میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

ہم وہیں کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔ پہلے تو وہ کسی سوچ میں مستغرق رہا پھر بولا۔

”تم نگینہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں“ میں نے صاف کہہ ڈالا۔

”نگینہ اور میں اپنے والدین کے بعد ایک ساتھ رہے ہیں۔ میں نے ہی اس کی نگہداشت کی ہے اور میری حیثیت باپ جیسی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور..... میں اپنی اس حیثیت کی وجہ سے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”میں سن رہا ہوں۔“ میں نے استفسار سے نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نگینہ ایک بے حد حساس لڑکی ہے اور بڑی حد تک خوف زدہ بھی۔“

”کس چیز سے خوف زدہ؟“

”معلوم نہیں۔“ اس نے میری جانب دیکھا۔ مجھے کوفت ہوئی۔ ہر کوئی کسی انجام نے خطرے کا کہہ رہا تھا مگر بتا کچھ نہیں رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ دل مراد کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

”مجھے ڈر ہے کہیں اپنے اس نفسیاتی خوف کی وجہ سے وہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔ اس کا ذہنی توازن بگڑنے میں دیر نہیں لگتی۔“

”اسے کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، لیکن میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر مظفر اس کا مسئلہ سمجھتا تھا، وہ اسی سلسلے میں اس سے کوئی بات کرنے والا تھا۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک سے مگنی کے وقت ڈاکٹر مظفر یہاں موجود تھا؟“

”نہیں۔ اس نے تو ٹھیکل کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔“

”نگینہ کا خیال ہے کہ ٹھیکل نے خودکشی کی تھی۔“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ اس کا اندازہ غلط ہے۔“

دل طلق میں دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔

میں اسے اماں ہی کہتا تھا۔ ”کیا ہوا اماں؟ سب خیریت... تو ہے نا وہاں؟“

”اگر نگینہ کا مگنیتر خاموشی سے اسے یہاں سے لے جاتا تو آج وہ بھی زندہ ہوتا۔“ اس نے کہا۔ اس کی بات پر مجھے جسم میں موت کی ایک سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

”لیکن یہاں ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔ بڑھیا خاموش رہی۔

”کیا آپ جانتی ہیں کہ ڈاکٹر مظفر کا قاتل کون ہے؟“ میں نے کہا۔ ”نگینہ کے مگنیتر کو کس نے ہلاک کیا؟“

”معلوم نہیں..... لیکن تم ابھی تک زندہ ہو۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بعض چیزیں قتل سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہیں۔“

اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں سوچتا رہ گیا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے فکر و تشویش نے آگھیرا تھا۔ ایسا کیا ہونے والا تھا نگینہ کے ساتھ کہ جسے اس کی بوڑھی اور پرانی وقادار ملازمہ نے بھانپ لیا تھا مگر وہ کچھ بتانے سے خائف تھی۔ اب مجھے ہی کھوج لگانا چاہیے تھا۔

میں وہاں پہنچا۔ شام کا وقت تھا۔ بڑی سیاہ اور اُداس سی شام محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی میں نگینہ کے مکان کے قریب ہی تھا کہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر چونک پڑا۔

بلاشبہ وہ نگینہ ہی کا کمر تھا۔ وہ کھڑکی سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر نیلا لبادہ تھا۔ نزدیک رکھے ہوئے ٹیبل لیپ کی روشنی براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس وقت بالکل خاموش، ساکت اور مغموم تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں جیسے اندھیرے میں بجھ رہی تھیں۔

میں خاموش کھڑا اسے وہیں سے گھورتا رہا۔ نگینہ کچھ دیر

اسی حالت میں کھڑی رہی پھر نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ میں نے ایک طویل ہمکاری بھری۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ آنکھیں ملنے ہوئے دوبارہ قدم بڑھایا اور پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔

مجھے تاریکی میں ایک آدمی نظر آیا تھا۔ وہ آدمی مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے اچانک اس سے ہولے سے ”ہیلو“ کہا۔

وہ شخص بُری طرح چونک پڑا۔ سراسیمگی کے عالم وہ بھاگتا ہی چاہتا تھا کہ میں یک دم تاریکی سے روشنی میں اس

”پھر اس کیس میں چہاری دلچسپی کی وجہ ضرور تھیں ہی ہوگی۔“

”یقیناً“ میں نے ساٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن انسپٹر صاحب! کیا آپ کسی ممکنہ قاتل کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟“

”بہت سارے آدمیوں پر شبہ ہے۔“ مختار نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تھین، دل مراد، کمال شاہ، قدیر..... اور.....“

”اور وہ جو اچانک پراسرار طور پر غائب ہو گیا، جس نے تھین سے اظہارِ محبت کیا تھا، مگر اس کے انکار پر وہ دل برداشتہ ہو کے کہیں اچانک غائب ہو گیا۔“ میں نے لقمہ دیا تو مختار کی آنکھیں ایک دم حیرت سے پھیل گئیں۔

”میرے خدا! اس کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں کیا۔ میں اس کا اتنا پتا کرتا ہوں۔“

”اور ہاں، قدیر پر بھی نظر رکھیں، مجھے لگتا ہے وہ کسی پرانی انتقامی آگ میں سلگ رہا ہے۔“ میں نے دل مراد اور بالخصوص بوڑھی ہاجرہ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق کہا۔

”وہ تو شاید پوری دنیا سے ہی انتقام لینے کا خواہ ہے۔“ اس نے طنزیہ کہا۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ آخر الذکر شخص غیر اہم اور غیر مشتبہ ہی لگا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن میں مقتول ڈاکٹر مظفر کے مکان میں تھا۔ انسپٹر مختار علی اور ایک سرکاری ڈاکٹر اور اس کی ٹیم بھی وہاں موجود تھی۔

مکان زیادہ وسیع نہیں تھا۔ بناوٹ کے لحاظ سے یہ ایک پرانی عمارت تھی۔ بڑے بڑے کمرے تھے۔ بھاری فرنیچر اور لمبے لمبے پردوں سے مزین اس مکان کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہاں کوئی تنہا مرد مقیم تھا۔

”ڈاکٹر کے بائیں بازو پر کلانی سے ذرا اوپر ایک زخم نظر آیا تھا۔“ مختار اور سرکاری ڈاکٹر ایک دوسرے سے مکالمہ کرنے لگے اور میں ان کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔

”قاتل قاتل نے پشت سے حملہ کیا تھا۔ ڈاکٹر اچانک اس کی جانب گھوما ہوگا۔ یہ زخم اسی صورت میں آسکتا تھا کہ حملہ آور نے لاشعوری طور پر بڑھے ہوئے ہاتھ پر حملہ کیا ہو اور پھر اس نے سر کا نشانہ لیا ہو۔“

میری نظروں میں چمکی ہوئی کھوپڑی گھوم مئی۔ تب میں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”قاتل کوئی

تھیل ایسا آدمی نہیں تھا۔“

”لیکن ڈاکٹر مظفر بھی اسی انداز میں قتل ہوا ہے۔“

”تھیل اور تھین کی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ تھین سے متاثر ہو گیا تھا، اس قدر کہ مٹنی کرتے ہی

اس نے تھین کو اپنے ترکے سے خواہ تھوڑا ہی سہی، اس کے نام کر دیا تھا۔ بہت تھوڑی زمین تھی وہ۔ اس نے شاید اپنی محبت سے تھین کو متاثر کرنا چاہا تھا، کچھ لوگ ایسے ہی غلط مزاج کے ہوتے ہیں۔ بے چارہ تھیل۔“

”مگنیر کا یہ ترکہ کیسے ملا تھین کو؟“

”ایڈووکیٹ مسعود کے ذریعے۔“

”ہم.....“

”تمہیں چند باتوں کا علم ہونا چاہیے۔“ وہ بولا۔

”اب جبکہ تم تھین سے شادی کرنا چاہتے ہو، تمہیں ان باتوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔ یہ جائیداد ہم دونوں کی ہے۔ حالانکہ

والد صاحب نے وصیت کی تھی کہ میں جائیداد کا تنہا وارث ہوں لیکن افسوس وہ وصیت نامہ ضائع ہو گیا۔“

”بہر کیف..... اور بھی کئی نوجوان تھین سے شادی

کے خواہاں تھے، وہ شاید اس سے زیادہ اس کی جائیداد سے

دلچسپی رکھتے ہیں، کم اوقات قدیر نے بھی جال پھیلانے کی

کوشش چاہی تھی۔“ وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ میں بھی

خاموش رہا۔

میرے ذہن میں اس وقت کئی گتیاں ایک ساتھ ہی

الچھ گئی تھیں اور میں بھی ایک ہر اس سانسوں کرنے لگا تھا۔ کیا

تھین بھی ایسے ہی کسی نامعلوم ہراس کا شکار تھی؟

☆☆☆

پولیس کی کارروائی ادھوری رہی۔ انسپٹر مختار علی

مریضوں کا ریکارڈ تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ میں حیران

تھا کہ اس معاملے کی جزیں کتنی گہری ہیں۔

میں کسی وجہ سے تھین سے بھی نہیں ملا اور سیدھا متعلقہ

تھانے کا رخ کیا۔

انسپٹر مختار علی سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی خوش

اخلاقی سے پیش آیا۔

”آؤ، جاوید میاں! کیسے آتا ہوا؟“

”کل جمیل اور دریا میں غوطہ خوری کا کیا نتیجہ رہا؟“

میں نے پوچھا۔

”کوئی خاص نہیں۔ کیا تم کہیں کسی اخبار رسالے میں

لکھتے بھی ہو؟“

”نہیں۔“

وجد سے اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ آپ کے دفتر میں کام کرتی ہیں اور آپ دونوں کی آپس میں اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے۔“

قوی الجہد بغض تھا۔ ضرور کھیل کو بھی اسی انداز میں قتل کیا گیا ہوگا۔“

چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "کیا
بکریاں کو بھی اسی انداز میں قتل کیا گیا تھا؟"

”ہوسکتا ہے، دراصل نگینہ اور اس کے خاندان کے متعلق بغیر ثبوت کے کوئی افواہ نہیں اڑائی جاسکتی۔ اُن کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔“

”قدر کے بارے میں کیا خیال ہے انیسٹر صاحب؟“ میں نے اچانک پوچھ لیا۔

”قدیر کے بارے میں یہی کہا جا رہا ہے کہ وہ دل مراد کے خاندان کا ایک چھپاؤ من ہے۔ مگر میری معلومات کے مطابق وہ انتہائی بزدل اور کم اوقات فحش ہے۔ اس میں اتنی ہمت اور جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ دو دو قتل کے بھیڑے پالے۔“

میں نے پُرسبوح انداز میں اپنے ہونٹ بھیج لیے۔
 ذرا دیر بعد وہ دونوں چلے گئے۔ میرا ذہن ایک بار
 پھر اس پراسرار کیس کی گتیاں سلجھانے میں لگ گیا۔ میرا اپنا
 ذاتی خیال تھا کہ یہ لوگ دو افراد کو چھوڑ کر دیگر معاملات میں
 تفتیشی وقت ضائع کر رہے ہیں۔

قدیر اور بیگم سرور پر انسپکٹر کو کڑی نظر رکھنی چاہیے تھی، اکثر کمانڈنٹ کمال شاہ تو شک و شبہ سے ویسے بھی بالاتر قرار یا جاکچکا تھا، اس لیے کہ اس کی شرافت اور وفاداری کی خدمتِ علاقے والوں نے بھی کر دی تھی۔ قدیر، اپنی ایسی لالچ کی گود میں بیٹھ کر یہ خطرناک اور خونی کھیل رہا تھا جو خود بھی متحول ڈاکٹر مظفر کی بیوی رہ چکی تھی۔

بہ قول دل مراد اور گنہگار کے، بیگم سرور جس کا نام عطیہ تھا۔ اس نے دولت کے لالچ میں ہی ڈاکٹر سے شادی کی تھی۔ نہ جانے کیوں پھر ان دونوں کی بین نہ پائی۔ پھر ان میں طلاق میں ہو گئی۔

بہر کیف..... میں ان دونوں کے باہر نکلنے کے بعد
اپنی عکینہ کی طرف جانے لگا تو کمال شاہ مجھے دروازے تک
پھوڑنے آیا۔

”آپ اس کیس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں، کیا آپ کسی اخبار سے وابستہ ہیں یا کوئی جرم و سزا پر مبنی کالم نگاری کرتے ہیں یا اس دلچسپی کی وجہ کچھ اور ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا تو یہی خیال ہے جی کہ آپ..... مکینہ بی بی کی

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ہو سکتا ہے نہیں، بلکہ یقیناً کہو جاوید میاں!“

اچانک ایک اور آواز ابھری۔ ہم دونوں نے ہی چونک کر اس سمت دیکھا تو ہمارے دائیں جانب سیڑھیوں کے پاس ہی قدیر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر رخ اور طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔

کمال شاہ اور مجھے حیرت ہوئی، یہ اچانک کہاں سے
برآمد ہوا تھا؟ شاید مکان کے عقبی حصے سے نمودار ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم کب اور کہاں سے آن چکے؟“ کمال شاہ نے بھی قدرے غمی سے کہا۔

”ادھر سے ہی۔“ وہ کندھے اُچکا کر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا اشارہ غنیمت جھیل اور دریائی پہنی کی طرف تھا۔ ”میں کافی دیر سے انسپکٹر مختار اور سرکاری ڈاکٹر کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔“

”تم پکڑے جاسکتے ہو اس طرح نفیسی افسران کی جاسوسی کرتے ہوئے۔“ کمال شاہ نے گھر کا۔ قدیر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ میں مختصر قد بچے طے کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔ کمال شاہ بھی میرے پیچھے تھا۔

میں قدیر کے بالکل قریب پہنچ کر بولا۔ ”مت بھولو کہ تم نے دھسکی دے رکھی ہے کہ اپنی دولت و جائداد دل مراد کے خاندان سے لے کر رہو گے۔“

”یقیناً دی ہے، میرا باپ سادہ طبیعت کا آدمی تھا، دل مراد کا باپ چالاک، اسی نے ہی نے میرے باپ کو نشے کا حادی بنایا پھر اسے زمینیں فروخت کرنے پر مجبور کر دیا۔“

قدیر بابتگ دہل بولا۔ میں اس کی جرات پر حیران رہ گیا۔

”اب تم بھی اس پُر اسرار قاتل کی نزد میں ہو، بہتر ہوگا

اپنا راستہ الگ کر لو۔ کیا تم نگینہ سے دولت کی خاطر شادی کرنا

چاہتے ہو؟“

”ذلیل کیلئے! تیری اوقات ہی نوکروں والی ہے۔“
مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کا گریبان دیوچ لیا۔ اسی
وقت ایک کار ہمارے قریب آن رکی۔ اس کے اندر سے
دل مراد اور نگینہ اترے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ ٹھیکہ فوراً کار سے اتر کے۔۔۔۔۔
 ہماری جانب دوڑی آئی۔ دل مراد بھی اتر آیا۔

”یہ کیوں لڑ رہا ہے تم سے؟“ دل مراد نے بھی قدیر کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔
 ”الٹی سیدھی بکواس کر رہا تھا۔“ میں نے قدیر کا گریبان چھوڑتے ہوئے کہا۔ قدیر مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔
 ”دفع کرو اسے، ایک نوکر کی کیا اوقات؟“ نگینہ نے کہا۔

”انسپکٹر معنی رعلی ایک سرکاری ڈاکٹر کے ساتھ یہاں پہنچنے والا تھا؟“ دل مراد بولا۔
 ”وہ چلے گئے۔“

”کچھ نیا رخ ملا تفتیش کا انہیں؟“ دل مراد نے پوچھا۔
 ”ابھی تو نہیں۔“

”ہم..... تم ہمارے ساتھ چلو۔“
 ”نہیں، میں ابھی کمال شاہ سے کچھ باتیں کروں گا۔“ میں نے محسوس کیا کہ نگینہ نے مجھے ساتھ چلنے کو بالکل بھی نہیں کہا۔ اس کے اس کھنور پن پر مجھے دکھ تو ہوا، لیکن پھر سوچا جانے کیا اس کی مصلحت ہو۔ یہی ہوتا ہے محبت میں، محبوب کی غلط روش بھی عاشق سر آنکھوں پر لے لیتا ہے۔
 وہ دونوں بہن بھائی چلے گئے۔ میں کمال شاہ سے تھوڑی دیر باتیں کرتا رہا، پھر اپنی بایک کی جانب بڑھ گیا۔ راستے میں بایک خراب ہو گئی۔ پرانا ماڈل تھا، کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ میں نے اتر کر دیکھا، سائڈ ٹول کھول کر سامان نکالا اور پلگ چیک کیا۔ اس میں کاربن آگیا تھا۔ وہ میں نے ریگ مال سے رگڑا اور پھر پلگ لگانے ہی والا تھا کہ دفعتاً مجھے عقب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔

میں اکڑوں بیٹھا پلگ لگا..... رہا تھا کہ ایک موٹا ڈنڈا فضا میں بلند ہوتے دیکھا، وہ کوئی آدمی تھا، جھاڑیوں کی آڑ سے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پرتول رہا تھا، میرے مڑ کر دیکھتے ہی وہ بھاگ اٹھا۔ ایک بات میں نے ڈنڈے میں ٹوٹ کی تھی، دھوپ میں اس سے چمک ابھری تھی اور میری آنکھوں پر پڑی تھی۔ شاید ڈنڈے کے سرے پر کوئی لوہے یا پتھر کی پتری چڑھی ہوئی تھی۔

میں درحقیقت ڈر گیا اور خوف زدہ بھی ہو گیا، اسی لیے مجھے اس کے تعاقب میں جانے کا خیال یا جرات نہ ہو سکی۔ وہ یقیناً خود کو روپوش رکھتے ہوئے مجھے ہلاک کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا مگر مجھے چوکتا پا کر وہ..... بھاگ اٹھا۔

تھوڑا وقت گزرا تو میں نے اسی وقت پلگ لگا کر بایک اسٹارٹ کی، شکر تھا کہ وہ صحیح ہو گئی تھی۔ میں نے اب گھر کے بجائے سیدھا بیگم سرور کے گھر کا رخ کیا۔ میرے اندر اب ایک عجیب سی جرات اور ہمت آ گئی تھی۔
 میں آندھی طوفان کی طرح بایک دوڑاتا ہوا بیگم سرور کے مکان پر پہنچا تو وہاں میں نے قدیر کو قریبی لان میں ایک لکڑی کی بیچ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے کپڑے مکے ہوئے تھے اور میلے بھی ہو رہے تھے۔

”تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے بایک سے اتر کر اس کے قریب آ کر کہا۔ میری بھانجی نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں نے نہیں تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر مظفر کے مکان میں ہماری ہونے والی سخت کلاہ کی طرف تھا، جب میں نے غصے میں اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

”میں اس حملے کی بات کر رہا ہوں، جب تم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ موٹے ڈنڈے کے ساتھ۔“
 ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو سیدھا یہاں پہنچا ہوں۔“ وہ حیران ہو کے بولا۔

”تو پھر تمہارے کپڑے اتنے میلے کیوں ہو رہے ہیں؟ تم ہانپ بھی رہے ہو۔“ میں نے شکی نظروں اُسے گھورا۔

”راستے میں ایک کتا میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ جاؤ اب اپنے گھر۔“ قدیر نے غصے سے کہا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”یاد رکھنا۔ میں یہ بات انسپکٹر معنی رعلی کو بتانے جا رہا ہوں۔“ میں نے اسے دھمکی دی۔ اس نے کوئی پروا نہ کی اور اندر چلا گیا۔

میں سیدھا تھانے پہنچا اور اصولی طور پر اپنے اوپر ناکام حملے کی روداد انسپکٹر معنی رعلی کو سنا ڈالی اور ساتھ ہی اپنے شک کا بھی اظہار کرتے ہوئے قدیر کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس کے بعد میں گھر آ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن فیصلہ کن اور سنسنی خیز ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کتنی خود بھی سلجھانے کی کوشش کروں گا، مگر انسپکٹر

”ہاں، تم.....“ مختار علی اسے گھور کر بولا۔ وہ قریب گیا۔ سب نظریں ایک ننگ ان پر جمی رہیں۔
 ”اے اٹھکڑی پہنا دو۔“ انسپکٹر کی تحکمانہ آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں کچھ حیرت بھری آوازیں ابھریں۔ گنبد بڑی طرح سسک پڑی۔ میں اسے سنبھالنے کے لیے بڑھا۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور بہت آہستگی سے اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔
 ”جاوید! مجھے معاف کر دینا۔“
 میں دنگ رہ گیا۔

”ٹھیک اور ڈاکٹر مظفر کا قاتل یہی آدمی ہے۔“ انسپکٹر نے اعلان کر دیا۔ ایک بار پھر کئی ہر اس زدہ آوازیں ابھریں۔ انسپکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔
 ”تیسرا قاتل یہ کل سہ پہر میں جاوید کا کرنا چاہتا تھا مگر سوئے اتفاق کا کام ثابت ہوا، اگر جاوید مجھے کل ہی اس واقعے کی اطلاع نہ دیتا تو شاید میں مجرم تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔“

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھی کو فرش پر پڑے تھیلے کو کھولنے کا کہا۔ وہ آگے بڑھا اور اندر سے ایک ڈنڈا برآمد کر لیا۔

”یہی ڈنڈا تھا وہ..... جس سے مجھ پر..... حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر قدیر.....“ میں جوش سے پکار اٹھا۔ کیونکہ اس ڈنڈے کے سرے پر مجھے پتیل کی پتری چڑھی دکھائی دے گئی تھی جس کی لمبائی چمک مجھ پر پڑی تھی۔

”دو حرج جاوید میاں!“ انسپکٹر نے مجھے خاموش کرایا اور آگے بولا۔ ”یہی وہ آلہ قتل ہے، جس سے مجرم دل مراد پہلے شکار کے دماغ پر ضرب لگا کر اسے بے بس یا بے ہوش کر دیتا تھا اس کے بعد آسانی سے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ جاوید نے جب مجھے اپنے اوپر ہونے والے حملے کی اطلاع اور جگہ بتائی تو میں ٹھلا نہ بیٹھ سکا اور اسی وقت وہاں جا پہنچا۔ نشان تازہ تھے، ایک دیہاتی تجربہ کار کھوجی کو لے کر میں قاتل کے پیچھے دل مراد کے گھر جا پہنچا مگر اسے ابھی کچھ نہ بتایا۔

”گنبد آرام کر رہی تھی۔ ہاجرہ نے دروازہ کھولا تو میں نے اس سے چھوٹے ہی دل مراد کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اور گنبد ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر مظفر کے گھر سے آئے تھے۔ گنبد کو چھوڑ کر دل مراد اپنی

مختار علی نے یہ سلجھا دی تھی۔

یوں بھی یہ اسی کا کام تھا۔ میں تو بس یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا تھا، اور گنبد کے نفسیاتی اور نامعلوم خوف کی وجہ کیا تھی۔

انسپکٹر مختار نے ہی مجھے فون کیا تھا کہ میں فوراً دل مراد کے ہاں پہنچوں۔

میں وہاں پہنچا تو سب لوگ موجود تھے۔ یوں جیسے کسی خونی اور سنسنی خیز ڈرامے کا ڈرامہ سین ہونے والا ہو۔ وہاں قدیر اور کمال شاہ بھی تھا۔ قدیر کو دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں وہی اصل مجرم تھا۔ انسپکٹر مختار کسی دوسرے کمرے میں تھا۔

”چوسے ملی کا کھیل شروع ہو گیا۔“ قدیر نے نعرہ لگایا۔ مجھے اس کی مکاری پر غصہ آنے لگا۔ جیسے بن رہا تھا۔ نیگم سرور نے اسے ڈانٹ کر خاموش کروا دیا۔ وہ باز نہ آیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

”انسپکٹر مختار! اب یہاں ہم میں سے کسی ایک کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ڈرامے کا ایک اسٹیج تیار کر رہا ہے۔“
 ”لیکن ہم سے تو کوئی قاتل نہیں؟“ کمال شاہ بولا۔

غیر ارادی طور پر میری نظر..... قریب موجود گنبد اور دل مراد پر پڑی۔ دونوں کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے تھے اور گنبد بچانے کیوں مجھ سے لگا ہیں چڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی وقت انسپکٹر مختار اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ اسٹنٹ بھی تھا جس نے ایک لبو ترے سے تھیلے میں کچھ اٹھا رکھا تھا۔

وہ اس نے فرش پر رکھ دیا۔ باہر موبائل پر پولیس موجود تھی۔ انسپکٹر نے اپنے اسٹنٹ کو اشارہ کیا۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا اور دوسا تھیوں کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ وہ تینوں اب چوکس کھڑے ہو گئے تھے۔

”قاتل یہاں سے بھاگنے کی کوشش بالکل نہ کرے۔ ورنہ مارا جائے گا۔“ انسپکٹر نے اعلان کر دیا۔ کشادہ کمرے میں ایک دم سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ گویا قاتل یہاں موجود تھا۔ سب بے چمن نظر آرہے تھے ماسوائے قدیر کے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے آثار تھے جیسے وہ اس ڈرامائی منظر سے خطا اٹھا رہا ہو۔

”دل مراد.....! ادھر آؤ۔“ مختار انسپکٹر نے اسے پکارا۔

”مم..... میں؟“ اس نے اپنے سینے کی جانب اشارہ

تھی کہ میں نے اسے آج تک ایک بھائی کی نظر سے ہی دیکھا ہے۔“ نگینہ بولی۔

”وہ خبیث تم سے شادی دولت ہی کی خاطر کرنا چاہتا تھا۔“ میں بولا۔ ”جہیں اس مسئلے کو میرے ساتھ ڈسکس کرنا چاہیے تھا، مگر تم نے بے چارے ڈاکٹر مظفر سے ڈسکس کیا، وہ علاقے کی معزز شخصیت کہلاتا تھا، تمہارا خیال تھا کہ وہ دل مراد کو سمجھانے کی کوشش کرے گا، اس نے یہ کوشش کی بھی مگر..... دل مراد اُلٹا تم پر برہم ہوا، نتیجے میں ڈاکٹر مظفر نے دل مراد کو دھمکی دے دی، جس کے نتیجے میں دل مراد نے اس کا قتل کر دیا۔ مجھے تو دل مراد کی بے وقوفی پر حیرت ہے کہ اس پر دولت و جائیداد کی طمع اس قدر غالب آچکی تھی کہ وہ جہیں بھی اس راز کو راز میں رکھنے کا کہتا تھا، حالانکہ اس کے آشکارا ہونے پر تو اس کا ہی فائدہ تھا، بعد میں مجھے انسپکٹر مختار علی نے بتایا کہ دل مراد یہ راز کسی وقت اچانک آشکارا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، شاید اس سے پہلے وہ ڈاکٹر مظفر کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا تا کہ اس پر کوئی شبہ نہ کر سکے۔“

”جاوید! تم بہت بہادر اور سچے انسان ہو، دل مراد کے لیے تم بھی خطرہ بن گئے تھے۔“ نگینہ بولی۔ ”لیکن تم نے آخری وقت تک میری مدد کی ٹھانے رکھی۔“

”مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں تم خدا نخواستہ کسی دباؤ میں آکر اس کی شریک جرم نہ قرار دے دی جاؤ، میں اسی لیے یہ ساری تنگ و دوکر رہا تھا۔“

”تمہارا احسان ہے مجھ پر۔“

”اب اس کا انعام چاہیے مجھے۔“ میں نے معنی خیز مسکراہٹ اور محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ میرا اشارہ سمجھ کے شرم سے گھٹا ہو گئی اور اسی لہجے میں بولی۔

”جو حکم کریں۔“

”میرا انعام میرے سامنے بیٹھا ہے، جیتا جاگتا، خوش اور مطمئن، بس، مجھے یہی چاہیے۔“ میں نے دل کی عمیق گہرائیوں سے کہا۔ اس نے جذبات تلے اپنی آنکھیں موند کر بہت دیر سے کہا۔

”میں بھی حاضر ہوں۔“

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

❖❖❖

ہاکی اٹھائے کہیں چلا گیا۔ واپس لوٹا تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ یہی سمجھی کہ شاید پریکٹس کر کے آرہا ہے۔ میں نے اس سے اس تھیلے کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ اس نے کمرے میں رکھا تھا اپنے..... میں وہیں جا پہنچا، دل مراد ہاتھ روم میں تھا۔

تھیلہ ابھی اس نے سنبھالا یا چھپایا نہ تھا۔ میں نے دیکھا اس کے اندر ہاکی کے بجائے ڈنڈا تھا وہی پیٹل کی پتری والا ڈنڈا۔ جس کے بارے میں جاوید نے مجھے بتایا تھا۔ اس ڈنڈے پر قاتل کے فنگر پرنٹس کے نشان ثبت ہیں۔“

اس کے بعد وہ سر جھکائے کھڑے دل مراد کی جانب بڑھا۔

”بہتر ہوگا، اب تم اپنے گناؤں نے جرم کا اقرار کر لو۔“ دل مراد نے اقرار کر لیا تو ایک ساتھ کئی مضطربانہ چیخیں کوچ اٹھیں۔

☆☆☆

”نگی! تم اگر پہلے ہی مجھے اس راز سے آگاہ کر دیتیں تو بہت سے حقائق پہلے ہی سے واضح ہو جاتے جس سے پولیس کی تفتیش بھی جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی۔“

دو روز گزرنے کے بعد میں نگینہ سے کہہ رہا تھا۔ اس وقت پہلی بار میں۔۔۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور ایک مسرت کے آثار دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے انجانے خوف کی وجہ بھی یہی تھی جس نے جہیں قریب قریب نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ تم دل مراد کے دباؤ میں آ گئی تھیں، لیکن حیرت کی بات ہے کہ تمہیں تب بھی دل مراد پر ایک خونی قاتل ہونے کا شبہ نہ ہوا؟“

”مجھے واقعی اس پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ تھا.....“ نگینہ ہولے سے بولی۔

”اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تم پر شادی کا دباؤ کیوں ڈالا کرتا تھا۔ یہ اس خبیث کا ایک قبیح فعل تھا۔“ میں نے کہا۔

”بے شک وہ تمہارا سگا بھائی تو کیا سوتیلا بھائی بھی نہ تھا، مگر..... لے یا لک تھا، باوصف اس کے تم دونوں بچپن سے ہی بھائی بہن کی طرح پروان چڑھے تھے، جبکہ لوگوں کو بھی یہی پتا تھا کہ تم اور دل مراد سگے بہن بھائی ہو، اب ایسے میں اگر یہ حقیقت بتادی جاتی، محض شادی کرنے کے لیے کہ دل مراد تمہارا بھائی یا تم اس کی بہن نہیں ہو تو لوگوں پر تب بھی برا اثر پڑتا۔“

”یہی بات میں اُسے بھی سمجھانے کی کوشش کیا کرتی